خطبہ رابع 4

نظامِ خلافت کے قیام کا نبویؐ طریق

ذیلی عنوانات

- گزشتہ مباحث پر ایک نظر
- خلافت علیٰ منہاج النبوۃ دنیا کا مشکل ترین کام
- نظام خلافت برپا کرنے کا لائحۂ عمل
- سیرت نبویؐ کے مطالعہ کی اہمیت
- انقلاب محمدیؐ......جامع انقلاب
- منہج انقلاب نبویؐ کے مراحل
- دعوت ایمان بذریعہ قرآن اور تربیت وتزکیہ
- نظام جماعت کی بنیاد......بیعت
- تنظیم کا مرحلہ
- اسلامی اجتماعیت کے تقاضے
- درویشی کے چار عناصر
- حق وباطل کا تصادم
- دورِ حاضر میں تصادم کا مرحلہ
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور آج کے حالات میں فرق
- نہی عن المنکر کے تین مدارج
- نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد عین فرض ہے
- ہمارا کام

گزشتہ مباحث پر ایک نظر

گزشتہ تین خطبات میں ہم نے علمی اور معلوماتی موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ مثلاً نظام خلافت کیا ہے، اس کے تحت ریاست کا دستوری اور سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس ریاست میں اسلامی معاشرہ کی شکل کیا ہوگی، اقتصادی اور معاشی نظام کے وہ اصول ومبادی کیا ہیں جو اس نظام میں اختیار کیے جائیں گے؟ اب تک ان تمام موضوعات پر گفتگو کا انداز علمی رہا ہے۔[1]

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ......دنیا کا مشکل ترین کام

آج ہماری گفتگو کا موضوع علمی مباحث نہیں، بلکہ یہ عملی مسئلہ ہے کہ نظام خلافت کیسے برپا ہوگا؟

اس ضمن میں میرا تأثر یہ ہے کہ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظام کے دوبارہ برپا ہونے کی صریح خبریں نہ دی ہوتیں[2] تو ہم کبھی یقین نہ کرتے کہ یہ کام دنیا میں ایک مرتبہ پھر ہو بھی سکتا ہے۔ میرا یہ تأثر اس لیے بنا ہے کہ پوری تاریخ میں یہ دورِ سعادت صرف ایک ہی بار دنیا نے دیکھا ہے۔ اس کام کے مشکل ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اس کام کی تکمیل کسی بھی رسول کے ذریعے نہ ہو سکی۔ اب رسالت ونبوت تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے تو ایک ایسا کام جو اس سے قبل رسولوں کے ذریعے بھی نہ ہو سکا وہ اب امتیوں کے ہاتھوں کیسے ہو جائے گا؟ انسان کی محدود عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ جو کام تاریخ انسانی میں صرف ایک بار اور بھی سید الانبیاء المرسلین کے ہاتھوں انجام پا سکا ہو وہ دوبارہ امتیوں کے ہاتھوں ہو جائے گا۔ پھر آج کے دور میں زمانے کا جو رخ ہے، انسان جس طرح مادیت پرستی میں غرق ہے اور تمام دنیا کا مطلوب ومقصود بھی یہی کچھ قرار پا چکا ہے تو عقل آخر کیسے یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ یہ کٹھن منزل بالآخر سر ہو جائے گی۔ پوری انسانیت پر مادہ پرست تہذیب کا غلبہ ہے۔ عالمی سطح پر اباحیت، عریانی اور فحاشی نے ایک آرٹ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور "کلچر" کے نام سے اس کا فروغ ہو رہا ہے۔ یہ پوری دنیا کا رخ ہے، جبکہ اسلام بالکل دوسرے رخ پر انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کام کو آسان سمجھ کر آگے بڑھنا اور کام کرنے کا بیڑا اٹھانا سخت نادانی ہے۔

اس کی ایک واقعاتی شہادت ہمارے پاس موجود ہے۔ پروپیگنڈے اور سیاسی دباؤ سے ہمارے دستور میں یہ دفعہ شامل تو ضرور کرائی گئی کہ "قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی۔" مگر اس پر عمل آج تک نہیں ہو سکا اور قرار دادِ مقاصد منظور ہوئے تقریباً نصف صدی مکمل ہونے کو ہے۔ لیکن اس سے اگلا قدم آج تک نہیں اٹھایا جا سکا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زمانے کا بہاؤ بالکل دوسرے رخ پر ہے جو اسلام کے عین مخالف سمت میں ہے۔ جاگیرداری کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں ہے، یہ گویا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا ہے۔ وہ مراعات یافتہ طبقہ جس کی آج خدائی نافذ ہے۔ اس کی خدائی چھین لینا آسان کام نہیں ہے۔

میں یہ ساری باتیں آپ کو پست ہمت بنانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ سوچ سمجھ کر قدم بڑھائیں، تا کہ بڑھنے والا کوئی قدم مشکلات کو دیکھ کر پیچھے نہ ہٹے۔ یاد رکھیے یہ مشکل ترین کام دوبارہ ہونا ہے۔ اس لیے کہ اس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو "الصادق والمصدوق" ہیں۔

نظام خلافت برپا کرنے کا لائحہ عمل

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور نظام خلافت کو برپا کرنے کے لائحہ عمل کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔ لیکن اس بیان کے سلسلہ میں، اپنے عمومی طریقے سے ہٹ کر میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے نفی واثبات کا اسلوب اختیار کروں گا۔ یہ بہت معروف اسلوب ہے۔ خود کلمۂ طیبہ کے دو اجزاء ہیں، پہلے جز کا تعلق نفی سے ہے، یعنی "لا الٰہ" اور دوسرے جز کا تعلق اثبات سے ہے، یعنی "الا اللہ"۔

میں پہلے چھ اعتبارات سے نفی کرنا چاہتا ہوں کہ پیش نظر کام اس طور سے نہیں انجام پا سکتا۔ اس طرح بہت سی باتیں خود بخود نکھر کر سامنے آ جائیں گی۔ اس کے بعد اثبات کا معاملہ آسان ہو جائے گا۔ جن چھ باتوں کی میں نفی کرنا چاہتا ہوں ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تین باتیں ایسی ہیں جن کو ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس کے باوجود ان کو بھی شعور کی سطح پر تازہ کر لینا مفید ہے، تا کہ انسان ان کے بارے میں یکسو ہو جائے۔

خواہش، دعا اور غیر حکیمانہ محنت وہ تین باتیں ہیں جن سے یہ منزل سر نہیں ہو سکتی۔

خواہش، دعا اور غیر حکیمانہ محنت؟

(۱) خواہش: ظاہر بات ہے کہ یہ عظیم کام محض خواہش[۳] سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۲۳ میں آتا ہے: کہ ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ یعنی ''اے مسلمانو! نہ تمہاری خواہش سے کچھ ہوگا نہ اہل کتاب کی خواہش سے۔'' سیدھی سی بات ہے۔ محض خواہش سے گندم کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ہل چلا کر زمین تیار کرنی ہوگی اور مناسب وقت پر بیج ڈالنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کو اس کی آبیاری کرنا ہوگی، ورنہ آپ کو فصل نہیں ملے گی، اس لیے کہ یہ دنیا ''عالم اسباب'' کہلاتی ہے۔ ان اسباب و علل سے ہٹ کر کسی کام کا ہو جانا معجزہ ہے، اور معجزوں کا سلسلہ ختم نبوت ہی کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔[۴] معجزوں کا ظہور نبوت کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بھی اتمام حجت کے لیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل کار نبوت کی بنیاد معجزات پر نہیں بلکہ آپؐ نے اس کام میں مصائب و مشکلات کے پہاڑوں کا سامنا کیا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنا سب کچھ لا کر قدموں میں ڈھیر کر دیا تو نصرت خداوندی آ گئی۔ اور یہ نصرت آج بھی آ سکتی ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

(۲) دعا: دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ کام محض دعا سے بھی نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر کہ دعا بہت بڑی شے اور بہت بڑی طاقت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''الدعاء مخ العبادة'' یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ آپؐ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے ''الدعاء هو العبادة'' یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ آپؐ نے دعا کی طاقت و قوت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''لا يرد القضاء الا الدعا'' گویا تقدیر معلق (قضائے غیر مبرم) بھی دعا سے بدل جاتی ہے۔ دعا کی یہ اہمیت مسلم ہے، لیکن دعا کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ دعا کرنے والا دعا کا منہ بھی رکھتا ہے کہ نہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ ﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ اے کتاب والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے (تمہارا منہ نہیں ہے ہم سے بات کرنے کا) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے۔'' اسی پر آپ اپنے بارے میں قیاس کر لیجیے کہ ''يـــا اهل القرآن...... یعنی اے اہل قرآن! تمہاری کوئی حیثیت نہیں جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو۔

دوسری بات یہ ہے کہ دعا تب قبول ہوتی ہے کہ جب انسان کے بس میں جو کچھ ہو وہ کر چکا ہو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میدان میں لا کر ڈال دو اس کے بعد اللہ سے دعا مانگو، بقول اقبال:

آج بھی ہو جو براھیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

نصرف خداوندی کا سلسلہ بند ہرگز نہیں ہوا ہے، لیکن اس نصرت کے حصول کا ایک قاعدہ ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۴ میں بیان ہوا ہے۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾

''کیا تم نے سمجھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تم وہ حالات آئے ہی نہیں ہیں جو تم سے پہلے والے لوگوں پر آ چکے ہیں۔ ان پر تکالیف آئیں، فقر و فاقے سے دوچار ہونا پڑا اور انہیں ہلا مارا گیا، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ (تب انہیں یہ خوشخبری سنائی گئی) سنو! اللہ کی مدد (بس) قریب ہے۔''

چنانچہ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کو جو یہ خبریں دی گئیں ہیں کہ ﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ (الصّف:۱۳) اور یہ کہ ''اللہ نے ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں سے استخلاف کا وعدہ کیا ہے۔'' تو یہ خبریں سن ۵ ھ کے آخر یا سن ۶ ھ کے اوائل میں دی گئیں تھیں۔ مکی دور کے تیرہ برس اور غزوۂ احزاب (خندق) تک کے ۵ برس انتہائی کٹھن مصائب کا دور ہے۔ ان سترہ برسوں میں گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں نے جہاد و قتال سے اپنے ایمان اور عمل صالح کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا: اے نبی! بشارت دے دیجیے کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی ہمارے امتحانات میں کامیاب ہو گئے ہیں اب ہماری مدد آیا چاہتی ہے اور فتح تمہارے قدم چوما چاہتی ہے۔''

میں نے یہ جو عرض کیا ہے کہ محض دعاؤں سے یہ کام نہیں ہوگا۔ تو اس کا تجربہ خود آپ بھی کر چکے ہیں۔ سن ۷۱ء کی جنگ میں بھارت کے خلاف ہماری دعاؤں کا کیا حشر ہوا۔ بہت سی مساجد میں قنوت نازلہ[۵] کا اہتمام کیا گیا۔ کتنی ہی صحبتیں تھیں جن میں یہ مؤثر دعا بڑی الحاح وزاری کے ساتھ پڑھی گئی۔ مگر نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ اس سے معلوم ہوا کہ دعا کے بھی کچھ

قواعد وضوابط ہیں۔ پروردگارِ عالم یہ بھی دیکھتا ہے کہ مانگنے والا کون ہے؟ ہمارے دین اور ہماری شریعت کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے؟ اس کا ذاتی کردار کیا ہے؟ لہٰذا دعاؤں میں بھی اثر تب ہوگا جب ہم اپنے عمل سے ثابت کر دیں گے کہ ہم دعا کے اہل ہیں۔[۶]

(۳) غیر حکیمانہ محنت ومشقت: اب میں تیسری بات عرض کر رہا ہوں جو کہ بہت ہی اہم ہے۔ اور وہ یہ بات ہے کہ یہ کام محض محنت ومشقت سے بھی نہیں ہوگا، چاہے یہ محنت و مشقت اپنے آخری درجے کو پہنچی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔ ہماری یہ محنت ومشقت تب ثمر آور ہوگی جب یہ محنت طریق محمد ﷺ کے مطابق ہو۔ مجرد قربانیاں دیتے چلے جانے سے نہ پہلے کچھ ہوا نہ اب کچھ ہوگا۔ آپ کے سامنے کی بات ہے کہ افغانستان میں دس لاکھ جانیں اخلاص وخلوص کے ساتھ دی گئیں لیکن نتیجہ کیا ہے باہم وست وگریباں ہیں اس لیے کہ جدوجہد طریق نبویؐ سے ہٹ کر کی گئی۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ وہاں جو خون خلوص کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اللہ کے حضور ضائع نہیں جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی کوئی نتیجہ نکالیں گے، لیکن ابھی تک نہیں نکلا۔ جو چیز ہمیں نظر آ رہی ہے وہ تو خانہ جنگی ہے۔ اسی طرح تحریک پاکستان کے دوران لاکھوں جانوں کی قربانی دی گئی، لیکن یہاں اسلام تو پھر بھی نہیں آیا۔ یہ مثالیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ:

خلاف پیمبرؐ کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

دو بزرگ شخصیتوں کے حوالے سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری قربانیاں طریق محمدیؐ پر چل کر ہی رنگ لا سکتی ہیں۔ ان دو بزرگوں میں سے ایک انبیاء کے بعد افضل البشر بالتحقیق حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور دوسری شخصیت امام دار الہجرت امام مالک رحمہ اللہ کی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تو اس موقع پر آپؓ نے ایک بہت پیارا خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے میں آپؓ نے فرمایا: ''لا یصلح آخرہ الا بما صلح بہ اولہ'' یعنی ایک بات اچھی طرح جان لو کہ اس معاملے (نظام خلافت) کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہوگی مگر اسی طور سے جس طور سے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کو مزید واضح کر کے امام مالکؒ نے بیان کیا کہ ''لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اوله'' یعنی اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہوگی مگر صرف اس طور سے جس طور سے کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔ اس بات کو اپنے قلب ودماغ میں کندہ کر لینا چاہئے کہ دوسروں سے مستعار لیے گئے طریقوں سے نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اور اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایک جز پر عمل کر کے بھی منزل سر نہ ہوگی۔ ہمیں سیرت محمدیؐ میں دیکھنا ہوگا کہ کیا چیز پہلے تھی اور کیا بعد میں اور یہ کہ سیرت کا مطالعہ ایک کل کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔ میں نے یہ بات اس مفصل حدیث مبارکہ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھی تھی کہ اس امت کا پہلا حصہ بھی خلافت علی منہاج النبوہ پر ہے اور آخری حصہ بھی خلافت علی منہاج النبوہ پر ہوگا۔ اب اس حدیث کو سامنے رکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امام مالکؒ کے اقوال پر تدبر کیجیے۔ فرمایا کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اسی طور سے کہ جس طور سے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جس طریق کار سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام اس وقت قائم ہوا تھا اسی طریق پر چلیں گے تو وہ نظام دوبارہ قائم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

عملی تجربے کی شہادت

میں نے جو باتیں نفیاً بیان کی ہیں کہ ان سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم نہیں ہو سکتی اب میں ان کا جائزہ Applied Form میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس جائزے میں توجہ کا ارتکاز سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر رہے گا۔ میری یہ گفتگو اصولی ہوگی کسی خاص جماعت یا گروہ کا ذکر کیے بغیر میں چند باتیں عرض کروں گا۔ اس ضمن میں پہلی بات جس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ جو خیال ہے کہ بس تبلیغ اور تلقین کئے چلے جاؤ۔ جب سب لوگ بدل جائیں گے تو نظام خود بخود بدل جائے گا، حالانکہ دعوت وتبلیغ طریق محمدی ﷺ کا محض نقطۂ آغاز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ محض تبلیغ سے یہ کام ہو جائے گا تو وہ بہت بڑے مغالطے میں ہے۔ دعوت وتبلیغ سے افراد میں تبدیلی آ جاتی ہے مگر نظام نہیں تبدیل ہوا کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم الفطرت لوگ دعوتِ حق کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ جس طرح مقناطیس لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اسی طرح ہمارا دین جو دین فطرت ہے وہ بھی سلیم الفطرت انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور وہ اس کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن نظام کا معاملہ الگ ہے اس کے ساتھ تو اصحابِ اقتدار لوگوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نظام سے خصوصی مراعات حاصل کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے یہ بگڑے ہوئے لوگ محض دعوت سے ماننے والے نہیں۔ ان کو منوانے کے لیے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ سورۂ حدید میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ (سورہ حدید: ۱۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا واضح تعلیمات اور معجزات کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور (ہاں) ہم نے لوہا اتارا جس کے اندر جنگ کی قوت ہے اور لوگوں کے لیے (دیگر) فائدے بھی ہیں، تا کہ اللہ پرکھ لے کہ (لوہے کی طاقت سے) کون ہے جو غیب میں ہوتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوی غالب ہے۔''

اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ انصاف پر لوگوں کو قائم کرنا (دین غالب کرنا) گویا اللہ کی مدد کرنا ہے، علاوہ ازیں دین کے غالب نہ ہونے کا مطلب اللہ کے خلاف بغاوت ہے، اور اس بغاوت کو فرو کر کے اللہ کے دین کو قائم کرنا اللہ کی مدد ہے۔ اور چونکہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا فرض منصبی اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے لہٰذا یہ رسول کی مدد بھی ہے۔ اسی لیے رسول کی دعوت ہوتی ہے: ''من انصاری الی اللہ'' (کون ہے میرا مددگار اللہ کے دین کے غلبے کے لیے)۔''

سورۂ حدید کی مذکورہ بالا آیت قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں سے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ نظام بدلنے کے لیے طاقت کا استعمال ناگزیر ہے،[۷] یہاں تک کہ کسی مرحلے پر اسلحہ بھی استعمال کرنا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض دعوت و تبلیغ سے نظام خلافت برپا کرنے کا خیال، اس خیال کے حقیقی تضمنات کو سمجھے اور جانے بغیر رکھتا ہے تو اس سے درگزر کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا تصور غیر شعوری طور پر ہی سہی نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی توہین (نعوذ باللہ) کو متضمن ہے۔ کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ کام محض دعوت و تبلیغ سے اگر ممکن ہوتا تو پھر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تلوار ہاتھ میں کیوں لی؟ میں تو کہتا ہوں کہ اگر محض دعوت و تبلیغ سے یہ کام مکمل ہو سکتا تو نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ تو دور کی بات ہے کسی کافر کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے۔ لیکن نظام بدلنے ہی کے لیے رحمۃ للعالمین کو یہ کام کرنا پڑا۔ اگر ایک طرف سینکڑوں کفار کا خون بہایا گیا تو دوسری طرف سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنی پڑی[۸] خود نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا خون دامن احد میں جذب ہوا اور طائف کی گلیوں میں بھی بکھرا۔

انتخابات کا راستہ

دعوت و تبلیغ کے علاوہ پوری دنیا میں جو دوسرا ''پاپولر'' طریقہ رائج ہے وہ الیکشن کا طریقہ ہے اور جس شے کا چلن ہو جاتا ہے اسی میں لوگوں کو سو خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ الیکشن بھی ان طریقوں میں سے ہے جو ہم کو استادان مغرب نے سکھائے ہیں۔ اقبال نے ان پر پھبتی کستے ہوئے کہا ہے:

الیکشن ممبری کونسل صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک چیز کا جب چلن ہو جاتا ہے تو وہ ذہنوں پر اپنا پورا تسلط جما لیتی ہے۔ اس وقت نہ معلوم کتنی جماعتیں اور کارکنان انتہائی اخلاص کے ساتھ اپنی توانائیاں اس طریق کار کے تحت کھپا رہے ہیں۔ یہ بات میں پورے خلوص دل سے کہہ رہا ہوں کہ جتنی جماعتیں بھی اس طریق کار کو اپنائے ہوئے ہیں ان کے کارکنان کے اخلاص میں مجھے ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ ہر جماعت کے پیچھے چلنے والوں کی اکثریت مخلص ہی ہوا کرتی ہے اور ان ہی مخلص کارکنوں کے دم سے ان جماعتوں کا وجود قائم ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ لیڈروں میں سے کسی کا معاملہ مختلف ہو، لیکن ان میں سے بھی کسی کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ نیت کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

ان تمام بزرگوں اور کارکنوں کے اخلاص کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کا یہ خیال کہ انتخابات کے راستے سے نظام بدلا جا سکے گا بہت بڑی نادانی ہے۔ اس ضمن میں میں ایک آخری درجے کی مثال بیان کر رہا ہوں کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انتخابات کے ذریعہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تو کیا ایسا کر سکتے تھے؟ یہ بات میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے کہی ہے کہ اس کو آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان میں گستاخی نہ قرار دے دیا جائے۔ لیکن ایک اور مثال ماضی قریب سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ایران میں آیت اللہ خمینی صاحب کی حکومت انتخابات کے ذریعے قائم ہو سکتی تھی؟ کوئی ایک شخص بھی اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ پھر اگر اس ضمن میں آپ کو قرآن کی نص مطلوب ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۱۶ میں کہتا ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

''اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا کر چھوڑیں گے۔''

جب کہ الیکشن کا سارا دارومدار اکثریت اور اقلیت پر ہے۔ پورا نظام ہی اس مفروضے پر چل رہا ہے کہ اکثریت حق پر اور اقلیت باطل پر۔

اب نصِ قرآنی کے بعد اگر عقلی دلیل مطلوب ہے تو وہ بھی موجود ہے۔ یہ بات ہر آدمی جانتا ہے کہ ہر ملک ایک مخصوص Politico-Socio-Economic ڈھانچہ پر قائم ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو بعض میں سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ کہیں آپ دیکھیں گے کہ قبائلی نظام رائج ہے۔ اس نظام کے تحت قبائلی سردار ہی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ آپ اس نظام میں رہتے ہوئے انتہائی عمدہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا انعقاد کر لیجیے، اس الیکشن میں بھی وہی Politico-Socio-Economic Structure ہی نمایاں ہو کر سامنے آئے گا جو اس معاشرے میں رائج ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں ۷۰ فی صد آبادی دیہات پر مشتمل ہے، اور یہ سب جاگیرداروں اور وڈیروں کے مزارعین ہیں۔ ان حالات میں آپ تبدیلی کیسے لائیں گے؟ اس نظام کے اندر انتخابات سے یہ تو ہو جائے گا کہ ایک لغاری کی جگہ دوسرا لغاری آ جائے، اسی طرح ایک مزاری کی بجائے دوسرا مزاری اور ایک جتوئی کی جگہ دوسرا جتوئی منتخب ہو جائے۔ لیکن ان کو ہٹا کر کوئی اور نہیں آئے گا۔ شہروں میں ممکن ہے کہ کوئی تبدیلی آ جائے اس لیے کہ شہروں میں جاگیرداروں کا قبضہ دیہاتوں جیسا نہیں ہے۔ شہروں میں کوئی عوامی تحریک چل سکتی ہے۔ جیسا کہ ایم کیو ایم کی تحریک کراچی میں چلی ہے۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ شہروں کی کوئی تبدیلی اس ملک کے اندر مجموعی فیصلہ کن نہیں ہو سکتی اگر اس تبدیلی کی اساس انتخابات ہوں۔

ان تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تھوڑے دیر کے لیے انسان سوچے تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ انتخابی طریق کار ہرگز کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تمام دلائل کے باوجود چونکہ انتخابی سیاست گھٹی میں پڑ گئی ہے، اس لیے اس سے جان کیسے چھڑائی جا سکتی ہے؟ انتخابی سیاست کو نہ چھوڑنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو کچھ سیٹیں ملی ہیں۔ انہیں قومی اسمبلی، سینٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں نشست مل جاتی ہے۔ ان چند سیٹوں کے لیے اپنے سائلا ور کارکنان کی صلاحیتوں کو قربان کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں پہلا الیکشن ۱۹۵۱ء میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیے ہوا تھا اور اب ۱۹۹۴ء ہے، آپ اندازہ لگائیں ۴۲ سال بیت گئے ہیں۔ تقریباً نصف صدی کے ان ناکام تجربوں کے بعد بھی عقل نہ آئے تو اسے کیا کہا جائے! قرآن حکیم کہتا ہے: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ﴾ (الاحقاف: ۱۵) یعنی بچہ بھی چالیس برس کی عمر کو شعوری اعتبار سے پختہ ہو جاتا ہے۔ کاش ہماری دینی جماعتوں کو بھی سبق حاصل ہو جائے اور وہ اپنے اختیار کردہ راستے پر نظرِ ثانی کے لیے تیار ہو جائیں۔

تشدد اور دہشت گردی

ایک اور خطرناک راستہ بھی بعض دینی تحریکوں نے دنیا کی دیکھا دیکھی اپنا لیا ہے اور وہ ہے چھاپہ مار کارروائیاں اور مخالفین یا معاندین کے خلاف تشدد اور دہشت گردی کے حربے۔ اگرچہ یہ کارروائیاں اسلامی تحریکوں نے تشدد کے جواب میں اختیار کی ہیں اور ان کے جواز کے لیے حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ''قتال'' کے مرحلے سے بھی استدلال کیا گیا ہے، لیکن اس طرح کی کارروائیوں سے بھی نظامِ خلافت کا قیام ممکن نہیں ہے۔[9]

بدقسمتی سے یہ معاملہ خاص طور پر عرب ممالک میں شدید ہو رہا ہے۔ مجھے ۱۹۷۹ء میں کچھ وقت مصر کے مختلف شہروں میں گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ نہایت دیندار نوجوان ان کارروائیوں میں ملوث تھے۔ میں ان کی دینداری کو اس طرح بیان کرتا ہوں کہ ایک فکری، انقلابی اور نظریاتی مزاج جماعت اسلامی نے پیدا کیا ہے۔ اور تدین، اتباعِ سنت اور عجز و انکساری کا حامل دوسرا مزاج تبلیغی جماعت نے پیدا کیا ہے۔ ان مصری نوجوانوں میں یہ دونوں مزاج جمع تھے، لیکن انہی نوجوانوں نے وہاں تشدد کے جواب میں دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اسی طرح دیکھیے! الجزائر کی اسلامی تحریک الیکشن کا راستہ اختیار کیے ہوئے تھی اور الیکشن میں اس کی کامیابی یقینی ہو چکی تھی۔ پہلے مرحلے کے نتائج میں اس تحریک کو نمایاں برتری حاصل تھی،[10] لیکن الیکشن میں اس کامیابی کے بعد ان کا راستہ تشدد سے روکا گیا۔ انتخابات منسوخ کر دیے گئے اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اسلامی تحریک نے بھی جوابی تشدد کا راستہ اختیار کر لیا۔[11] اس طرح کی کارروائیاں قومی فوج اور ملکی حکمرانوں کے خلاف کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔ اس قسم کی کارروائیاں قابض افواج (Occupation armies) اور غیر ملکی حکومت کے خلاف مفید اور مؤثر ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ خود الجزائر میں بھی فرانسیسی استعمار کے خلاف طویل مسلح جدوجہد جاری رہی اور بالآخر فرانس الجزائر میں بھی فرانسیسی استعمار کے خلاف طویل مسلح جدوجہد جاری رہی اور بالآخر فرانس الجزائر سے جانے پر مجبور ہو گیا۔[12] جب کہ قومی فوج کے خلاف اس طرح کی پر تشدد تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی ان دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ (اوّل تو) الجزائر کے معاملے میں قابض فوج کی Suply Line یعنی فرانس بہت دور واقع تھا۔ فوج کا دارومدار وہاں سے اسلحہ وغیرہ کی فراہمی پر تھا۔ ویت نام میں امریکہ جیسی سپر طاقت بھی اسی وجہ سے مار کھا گئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قومی فوج اور ملکی حکومت کے رابطے ملک میں بسنے والی آبادی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ان کے خلاف پر تشدد کارروائی سے بالعموم ان کے ساتھ قوم کی ہمدردی اور تعاون میں اضافہ ہو جاتا ہے،اور تشدد کی راہ اپنانے والی تحریک کی مخالفت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سیرۃ نبویؐ کے مطالعہ کی اہمیت

نبی اکرم ﷺ کے طریق کار کو میں نے ''انقلابی جدوجہد'' کا عنوان دیا ہے،اور اس جدوجہد کے تمام مراحل کو سیرۃ النبی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔میں نظام بدلنے کے عمل کو ''انقلاب'' کا نام دیتا ہوں اور اس انقلابی عمل کا واحد ذریعہ سیرۃ النبیؐ ہے۔یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ اگر ذرا سا بھی گمان ہو جائے کہ اس زمین میں تیل کا خزانہ چھپا ہوا ہے تو محض اس گمان کی بنیاد پر وہاں سے تیل نکالنے کے لیے کروڑوں روپے بے دریغ خرچ کر ڈالے جاتے ہیں،اور اگر کہیں یہ یقین ہو جائے کہ اس سرزمین میں تیل یقینی طور پر موجود ہے تو پھر کیا کہنے! جب ہم کو معلوم ہے کہ انقلابی جدوجہد کے مراحل اور مدارج کا علم ہم کو سیرۃ النبیؐ سے حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ سیرت اس علم کا واحد ذریعہ ہے تو ہماری پوری توجہ اسی پر مرکوز ہونی چاہیے کہ ''جا ایں جا است''۔ پھر جب ہم اس یقین کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کا مطالعہ کریں گے تو بین السطور جو کچھ ہے اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔سیرۃ النبی ہی سے ہم سمجھ سکیں گے کہ آپؐ نے پہلے مرحلے میں کیا کیا کام انجام دیے اور دوسرے مرحلے میں کیا انجام دیے،اور وہ کون سی شرائط تھیں جن کی تکمیل کے بعد آپؐ نے اگلے مرحلے میں قدم رکھا۔

''انقلابِ محمدیؐ''......جامع انقلاب

انقلابی جدوجہد کے مراحل و مدارج کا ادراک فقط سیرۃ النبیؐ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔میں اپنے اس دعویٰ کو دو حوالوں سے واضح اور مبرہن کرنا چاہتا ہوں۔اس دعویٰ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں دوسرے جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ سب جزوی تھے۔پوری انسانی تاریخ میں ہر اعتبار سے کامل انقلاب کی واحد مثال ''انقلاب محمدیؐ'' ہے۔سوا دو سو سال قبل برپا ہونے والے ''انقلاب فرانس'' کا بہت چرچا ہے۔لیکن اس انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ تبدیل ہوا تھا۔اس کے نتیجے میں نہ عقائد بدلے، نہ اخلاق بدلے، نہ معاشرت بدلی حتیٰ کہ معاشی ڈھانچہ بھی بڑی حد تک جوں کا توں رہا۔گویا اجتماعی زندگی کا صرف ایک پہلو تبدیل ہوا۔

اسی طرح اس صدی کے آغاز میں بالشویک (سوشلسٹ) انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ تبدیل ہوا۔اور نئے معاشی ڈھانچہ کی بنیاد نجی ملکیت (Private Ownership) کو ختم کر کے تمام وسائل دولت کو قومیانے (Nationalize) کرنے پر رکھی گئی۔مگر اس معاشی ڈھانچے کی تبدیلی سے عقائد،اخلاق،اقدار اور تہذیبی روایات اور اندازِ فکر و نظر میں جس انقلابی تبدیلی کے وعدے کئے گئے تھے وہ سب باطل ثابت ہوئے۔

ان دونوں انقلابات کے برعکس اگر نبی اکرم ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کو دیکھا جائے تو ہمیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خوردبین کے نیچے رکھ کر تلاش کرنا پڑے گا کہ اس میں سے کونسی شے تبدیل ہونے سے بچ گئی۔لوگوں کے عقائد بدل گئے،نظریات بدل گئے،اقدار بدل گئیں،غرض زندگی کے شب و روز اور صبح و شام تک بدل گئے۔معاشی اور سیاسی ڈھانچہ ہی نہیں تبدیل ہوا، بلکہ ایک ایسی قوم جس کے سب سے متمدن قبیلے میں لکھنا پڑھنا جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے وہ علم و تحقیق میں بھی دنیا کی امام بن گئی اور قدیم علوم کے احیاء کے علاوہ بہت سے جدید علوم و فنون کی موجد قرار پائی۔وہ جھگڑالو قوم جس کو قرآن حکیم نے ''قومًا لُدًّا'' کہا ہے اور مولانا حالی نے جس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے: ؎

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

وہ دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی اور ایسی امن پسند قوم بن گئی کہ حضور اکرم ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ایک عورت صنعاء سے حضرموت تک سفر کرتی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوتا،عورتیں ان راہوں پر سفر کرنے لگیں جہاں بدرقوں کے بغیر بڑے بڑے قافلوں کا نکل جانا آسان نہ تھا۔جو قوم نظم سے قطعاً نا آشنا تھی اور جس کا ہر فرد فرعون بے سامان بنا ہوا تھا وہ نظم کی ایسی خوگر ہوگئی کہ ان کی پنج وقتہ عبادت بھی اذان،اقامت،صف بندی اور امام کے "Cautions" کی ایسی پابند ہوگئی کہ اس پر فوجی ڈرل کا گمان ہونے لگا۔یہ ہے وہ انقلاب عظیم جو محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا۔

انقلابِ محمد ﷺ اور دوسرے انقلابات میں ایک اور فرق بھی موجود ہے کہ دوسرے جتنے بھی انقلاب برپا ہوئے وہ کئی نسلوں (generations) میں جا کر مکمل ہوئے۔ایک نسل نے صرف فکر دیا۔گویا اس نسل میں مفکرین پیدا ہوئے۔یہ مرد میدان تو تھے نہیں کہ کسی انقلابی جدوجہد کا آغاز کر کے اسے کامیاب بناتے۔تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔مثلاً والٹیر اور روسو بہت بڑے مفکر اور مصنف ضرور ہیں، چنانچہ انقلابِ فرانس کی پشت پر انہی کا فکر کارفرما تھا۔لیکن انقلاب کا عملی قائد تو روسو نہ تھا، بلکہ انقلاب فرانس کا تو سرے سے کوئی قائد ہی نہ تھا اور اسی لیے یہ ایک بڑا خونی انقلاب ثابت ہوا۔

دوسرا انقلاب جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔''بالشویک انقلاب'' تو اس کی پشت پر کارل مارکس اور انجلز کے افکار موجود تھے۔ کارل مارکس نے "Das Capital" (داس کیپیٹل) جیسی یادگار کتاب لکھی۔ علامہ اقبال نے اس کے اور اس کی کتاب کے بارے میں کہا تھا: ''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'' (پیغمبر تو نہیں ہے مگر اپنی بغل میں کتاب رکھتا ہے)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس نے فکر دیا، لیکن وہ خود اپنی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہ کر سکا۔ اس نے اپنی کتاب جرمنی اور انگلستان میں مکمل کی (اور اس کے فلسفے کے مطابق انقلاب بھی انہی مکمل صنعتی اور سرمایہ دار ممالک میں آنا تھا) جبکہ انقلاب آیا روس جیسے صنعتی لحاظ سے پس ماندہ زرعی معیشت رکھنے والے ملک ہیں!

اس کے مقابلے دیکھیے انقلاب محمدی ﷺ میں تمام مراحل اور مدارج فرد واحد کی اپنی زندگی ہی میں تکمیل پذیر ہو گئے۔ آپ ﷺ تن تنہا دعوت کا آغاز کر رہے ہیں۔ نہ آپؐ کے پاس کوئی جماعت ہے، نہ کوئی ادارہ ہے اور نہ پہلے سے بنی ہوئی کوئی امت ہے۔ آغازِ دعوت میں آپؐ کی زوجہ محترمہ، آپؐ کے جگری دوست، آپؐ کے آزاد کردہ ایک غلام اور آپؐ کے چچا زاد کم عمر بھائی [۱۳] ایمان لائے۔ دس سال کی محنت شاقہ سے بمشکل سوا سو یا ڈیڑھ سو لوگ ایمان لائے۔ پھر وہی فرد واحد کوہ صفا پر کھڑے ہو کر ''واصباحاہ'' کا نعرہ بھی لگا تا ہے اور آپ دیکھیں کہ ایک مرحلے میں وہی شخص ﷺ میدان بدر میں فوج کی قیادت بھی فرما رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انقلاب کی تکمیل تک اکیلا وہی شخص ﷺ تمام مراحل میں قیادت کے تمام تقاضے پورے کرتا رہا۔ یہ بات آپ کو پوری انسانی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس اعتبار سے بھی ہم کو یقین کر لینا چاہئے کہ اس انقلابی عمل کا واحد ذریعہ اور ماخذ سیرۃ محمدیؐ ہے۔

منہج انقلاب نبوی ﷺ کے مراحل

اب میں سیرۃ النبی ﷺ سے اخذ کردہ مراحل انقلاب کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے مختلف مواقع پر میں منہج انقلاب نبویؐ کو چھ مراحل میں تقسیم کر کے پیش کرتا رہا ہوں۔ یعنی (۱) دعوت (۲) تنظیم (۳) تربیت (۴) صبر محض یا (Passive Resistance) (۵) اقدام یا (Active Resistance) اور بالآخر (۶) مسلح تصادم یا (Armed Conflict)۔ آج میں ان مراحل کو سادہ زبان میں مختصر کرتے ہوئے تین مراحل میں بیان کروں گا۔

دعوتِ ایمان بذریعہ قرآن اور تربیت وتزکیہ

پہلا مرحلہ ''دعوتِ ایمان بذریعہ قرآن'' ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر نظام کی کوئی فلسفیانہ بنیاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ فلسفہ ذہن میں نہ بیٹھ جائے اس انقلاب کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسلام کی نظریاتی اور فلسفیانہ بنیاد ''ایمان'' ہے، [۱۴] مگر ہماری عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ ہم ایمان سے محروم ہیں۔ ہم اس لیے مسلمان ہیں کہ مسلمان والدین کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ بس ایک موروثی عقیدہ ہے جو ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہے۔ اس عقیدے کا ہمارے فکر و عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہماری وہ اقدار جن سے ہم اپنا طرز عمل متعین کرتے ہیں ہمارے عقیدے کا ان اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ اس کیفیت سے بچے ہوئے بہت کم لوگ ہیں۔ ہم سے بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ ہم بس مسلمان ہیں۔ اور اس کو بھی اللہ کا بڑا فضل ہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے ہم کو مسلمانوں کے گھر میں پیدا کیا، ورنہ خدانخواستہ اگر ہماری پیدائش کسی ہندو یا عیسائی کے گھر میں ہوتی تو ہم میں سے کتنے لوگ ایمان قبول کر لیتے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ خود لے سکتا ہے۔

سورۂ حجرات کی آیت (نمبر ۱۵) میں ایمان کو Define کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (سورہ حجرات:۱۵)

''مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مال کے ساتھ جہاد کیا۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں حقیقی ایمان کا ذکر ہے۔ یعنی وہ ایمان جو یقین کے درجے کو پہنچ چکا ہو، بقول اقبال:

یقین پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

سورۂ حجرات کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دل میں حقیقی ایمان موجود ہو اور عمل میں جہاد نہ ہو۔ لہٰذا اس انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ ''دعوت ایمان بذریعہ قرآن'' ہے۔ اسی لیے سورۂ نساء آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اس نے نازل کی۔''

اس آیۂ مبارکہ میں گویا کہا گیا ہے کہ قانونی ایمان تو تم کو پہلے ہی حاصل ہے، لیکن حقیقی ایمان جو بہت بڑی قوت ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اس موقع پر ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کے علاوہ بھی حصولِ ایمان کے کچھ راستے ہیں۔ میں خود تسلیم کرتا ہوں کہ حصول ایمان کا سب سے آسان ذریعہ اصحاب ایمان و یقین کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبہ ۱۱۹)

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کی معیت اختیار کرو۔''

ظاہر ہے کہ کہیں آگ جل رہی ہو تو اس کے قریب رہنے سے حرارت خود بخود پہنچے گی۔ اس کے بعد کسی اور محنت کی ضرورت نہیں۔ گویا اصحابِ ایمان کا قرب ہی کافی ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

حصول ایمان کا دوسرا راستہ احکامِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا راستہ ہے۔ ایمان اور عمل صالح دوطرفہ اثرات کے حامل ہیں۔ ایمان عمل صالح سے پیدا ہوتا ہے اور عمل صالح میں اضافہ ایمان میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا مسلسل عمل سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو تسلیم کرنے کے باوجود اب جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ بہت اہم ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں سے جو ایمان پیدا ہوتا ہے وہ غیر شعوری ہوتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے ساتھ شعوری عنصر (Intellectual Element) شامل نہیں ہوتا۔ ان طریقوں سے جو ایمان پیدا ہوتا ہے ان کو Blind Faith کہنا زیادہ مناسب ہے۔ تاہم اس غیر شعوری ایمان کا بھی اثر عمل پر پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ایمان رکھنے والا شخص بھی اس راہ میں کوئی قربانی دینے میں کمی نہیں کرے گا۔ یہ Blind faith بھی بڑی نعمت ہے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انقلابی عمل کے آغاز کے لیے بہرحال اُس شعوری ایمان کی ضرورت ہے جس کے ساتھ Conviction شامل ہو، اور یہ Conviction کسی نہ کسی Intellectual Element کی موجودگی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ انقلابی عمل جب ان مراحل میں داخل ہو جائے، جب جان کی بازی کھیلنے کی ضرورت ہوتی ہی۔ اس وقت یہ Blind Faith والے اگر مل جائیں تو یہ بھی بڑے قیمتی ثابت ہوں گے۔ اس لیے کہ اس وقت جان کی بازی کھیلنے کے لیے ان میں بھی پوری قوت اور آمادگی ہوتی ہے۔

شعوری ایمان اور اس کی اہمیت

شعوری ایمان کا تذکرہ سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۸ میں اس طرح کیا گیا ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ۚ قف عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ﴾

''اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ اے لوگو! یہ ہے میرا راستہ۔ میں اللہ کی طرف پوری بصیرت کے ساتھ بلا رہا ہوں اور وہ بھی جنہوں نے میری اتباع کی۔''[15]

یہ بہت بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کی زبان مبارک سے شہادت دلوائی ہے کہ نہ صرف آپؐ خود بلکہ آپؐ کے متبعین بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہے ہیں بلکہ نورِ بصیرت سے بہرہ ور ہیں۔ یہ وہ ایمان ہے جس کے ساتھ شعور اور بصیرت باطنی موجود ہے۔ اس قسم کے ایمان کے حصول کا واحد سرچشمہ اور منبع قرآن حکیم ہے۔ قرآن کے سوا یہ کہیں اور سے مل ہی نہیں سکتا۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اسی طرح علامہ اقبال نے ایک بہت اچھا شعر اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا ہے: ؎

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے، علم نخیل بے رطب

گویا فرماتے یہ ہیں کہ انہوں نے جتنا کچھ فلسفہ وغیرہ علوم پڑھے تھے وہ سب نخیل بے رطب (نہ پھلنے والا کھجور) تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس شعوری ایمان کا ذکر قرآن مجید بار بار مختلف اسالیب میں کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں شعوری ایمان رکھنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا﴾ (آیت:۱۹۱)

''جو اللہ کا ذکر اٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں اور پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے بھی) اور آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے پر غور کرتے ہیں۔ (اور اس شعوری نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! یہ سب کچھ تو نے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔''

اسی طرح عقل و شعور اور فکر و تدبر کی اہمیت کے اظہار کے لیے، لعلکم تعقلون، لقوم یعقلون، لعلکم تتفکرون، افلا یتدبرون القران اور لیدبروا آیاتہ، وغیرہ مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔

قرآنِ مجید ہی شعوری ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اس حقیقت کے عقلی دلائل کے علاوہ نقلی دلائل بھی موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے لیے جتنی بھی اصطلاحات قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں ان سب کے لیے قرآن ہی کو ذریعہ اور وسیلہ معین کیا گیا ہے، مثلاً:

﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ (ق: ۴۵)

''تو تم اس قرآن کے ذریعے تذکیر کرو۔''

﴿وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ﴾ (الانعام:۱۹)

''اور (کہئے) میری طرف یہ قرآن نازل کیا گیا تا کہ میں اس کے ذریعے ''انذار'' کروں۔''

﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (مریم:۹۷)

''تو ہم نے اس کو تمہاری زبان پر صرف اس لیے رواں کر دیا ہے کہ تم اس کے ذریعے متقین کو تبشیر کرو اور جھگڑالو قوم کو انذار!''

﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ﴾ (المائدہ:۶۷)

''تبلیغ کریں اس کی جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا۔''

﴿وَجَاھِدْھُمْ بِهٖ جِھَادًا کَبِیْرًا﴾ (الفرقان:۵۲)

''اور اسی (قرآن) کے ذریعے ان سے جہادِ کبیر کیجیے۔''

دیکھئے ''تبلیغ''، ''تذکیر''، ''انذار''، ''تبشیر'' اور ''جہاد'' سب کے لیے قرآن حکیم کو وسیلہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ جہاں بھی جاتے وہاں لمبے چوڑے خطبے دینے کے بجائے قرآن مجید ہی پڑھ کر سناتے تھے۔

شعوری ایمان کے ثمرات

چنانچہ اس انقلابی جدوجہد کا پہلا قدم ''دعوت ایمان بذریعہ قرآن'' ہے۔ اس طرح سے جو حقیقی ایمان حاصل ہوگا اس کے نتیجے میں سب سے پہلے انسان کا عمل درست ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ دل میں حقیقی ایمان ہو اور عمل درست نہ ہو ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بندے کو عطا کیا ہے، یعنی اسے اپنے جسم و جان اور مال و منال پر جو شخصی خلافت عطا کی ہے اس سے کام لے کر وہ اپنا سب کچھ اللہ کے دین کی راہ میں کھپا دے گا۔ میں نے پہلے خطبۂ خلافت میں بتایا تھا کہ خلافت کی ایک قسم خلافت شخصی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کے استعمال میں ہم شخصی طور پر خلیفہ کی حیثیت سے کام کرنے پر مامور ہیں۔ اس شخصی خلافت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اصل مالک جس کام میں ان چیزوں کو کھپانے کا حکم دیتا ہے اس کام میں ان کو بے دریغ کھپا دیا جائے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ﴾ (الحدید:۷)

یعنی ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور (اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ) خرچ کرو اس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔''

ایمانِ حقیقی کا تیسرا نتیجہ ’’جہاد‘‘ ہے۔ یہ ایمان کا منطقی نتیجہ ہے، جیسا کہ سورۂ صف کی درج ذیل آیت کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ:

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط﴾ (آیت:۱۱)

’’تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے۔‘‘

چوتھا نتیجہ ’’تزکیہ‘‘ ہے۔ تزکیہ حقیقتاً کوئی علیحدہ عمل [۱۶] نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان میں جتنی گہرائی بڑھتی چلی جائے گی منطقی طور پر اس کا باطن اتنا ہی زیادہ منور ہوتا چلا جائے گا۔ نورِ ایمان سے ظلمات اور تاریکیاں چھٹتی چلی جائیں گی۔ یہ ہے تزکیہ اور تجلیہ باطن کا نبویؐ طریقہ۔ [۱۷]

میں نے منہجِ انقلابِ نبویؐ کے دو مراحل کو یکجا کر کے ان کو ایک مرحلے کے طور پر بیان کر دیا ہے، یعنی دعوت ایمان اور تزکیہ۔

انقلاب کے لیے سب سے پہلے ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے جن کے قلوب و اذہان نورِ ایمان سے منور ہو چکے ہوں۔ [۱۸] یہ لوگ آپ کی دعوت سے اس انقلابی فکر کی طرح کھنچیں گے۔ یہ دعوت، دعوتِ ایمان ہو گی اور اس کا ذریعہ قرآن ہوگا۔ اب ان جانثاروں کی تربیت و تزکیہ ہوگا، اور تزکیہ کا یہ عمل بھی قرآن ہی کے ذریعے ہوگا۔ گویا یہ دونوں عمل یعنی دعوت اور تزکیہ قرآن کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں چار مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق﴾ (الجمعہ:۲)

’’وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔‘‘

یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں ان الفاظ میں وارد ہوا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ آیت:۱۶۴)

’’اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول انہی میں سے اٹھایا۔ وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔‘‘

ان دو مقامات کے علاوہ یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی دو مقامات [۱۹] پر آیا ہے اور یہ سارا عمل دراصل مردانِ کار کی تیاری ہے۔ یہ جانثار مجاہد تیار ہوں گے تو جہاد کا عمل شروع ہو گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلنے والے چھ لاکھ افراد تھے جو بارہ قبیلوں میں تقسیم تھے۔ مگر تربیت نہ ہونے کے باعث یہ بڑے ’’بودے‘‘ لوگ تھے۔ جب مصر سے ہجرت کے بعد قتال کا مرحلہ آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اس فرض کی ادائیگی کے لیے پکارا تو انہوں نے جواب دیا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝﴾ (المائدہ ۲۴)

’’(موسیٰ علیہ السلام!) تم اور تمہارا رب (دونوں) جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔‘‘ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۝﴾ (المائدہ ۲۵)

’’(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا: میرا بس نہیں ہے مگر اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر تو (اے میرے رب!) ہمارے اور ان بگڑے ہوئے (فاسق) لوگوں کے درمیان تفریق کر دے۔ (میں ان ناہجاروں کے درمیان رہنے پر تیار نہیں ہوں کہ فرعون کی غلامی سے نجات پانے اور اپنے عظیم معجزوں کو دیکھ لینے کے باوجود جن کا یہ حال ہے!!)‘‘

اس کے مقابلے میں مکے سے ہجرت کے بعد جب بدر کا مرحلہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلح تین سو تیرہ اصحاب سے قریش کے لشکر جرار کا مقابلہ کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیں۔ جنہوں نے کہہ دیا تھا کہ: ’’تم اور تمہارا رب (دونوں) جاؤ اور جنگ کرو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔‘‘ ہم تو آپؐ کے آگے سے، آپؐ کے پیچھے سے، آپؐ کے دائیں سے اور آپ کے بائیں سے جنگ کریں گے۔ اسی لیے اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا:

خدا کے کام دیکھو! بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

غارِ حرا ہی سے تو نزول قرآن شروع ہوا تھا اور بقول مولانا الطاف حسین حالی وہیں سے مس خام کو کندن بنانے والا نسخۂ کیمیا (قرآن) ہاتھ آیا تھا۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیرت نبویؐ کے ابتدائی پندرہ برس تک اسی نسخہ کیمیا سے کیمیا گری ہوتی رہی۔ دعوت وتبلیغ سے لے کر تزکیۂ نفوس تک تمام مراحل قرآن کے ذریعے ہی طے ہوتے رہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد بدر کا مرحلہ آیا۔ تاریخ میں ہمیں بدر کا مرحلہ بہت اہم نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں اہم وہ مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں بدر کے لیے لوگ تیار کئے گئے۔

تنظیم کا مرحلہ

ان مردانِ کار کی تیاری کے بعد جو دوسرا مرحلہ آتا ہے وہ تنظیم کا مرحلہ ہے۔ وہ لوگ جو اس دعوت ایمان کے نتیجے میں تزکیۂ نفوس کے مراحل سے گزر کر اپنی ذات پر اللہ کا دین قائم کر چکے، جب تک انہیں کسی مضبوط تنظیم کے اندر جوڑا نہیں جائے گا یہ کچھ نہ کر سکیں گے۔[20] چنانچہ نبی ﷺ نے جماعت کی اہمیت کو بہت واضح کیا ہے۔ آپ ؐ کا ارشاد گرامی ہے: ''آمر کم بخمس'' کہ مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں ''الله امرنی بهن''یعنی اللہ نے مجھے ان (باتوں) کا حکم دیا ہے۔[21] وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا ہے:

((بالجماعه والسمع والطاعة والهجرة والجهاد في سبيل الله))

''یعنی التزام جماعت کا (حکم)، سننے کا (حکم)، ماننے کا (حکم)، (راہ خدا میں ترک وطن) یعنی ہجرت کا حکم) اور اللہ کی راہ میں جہاد کا (حکم)۔''

ہمارے فکری افلاس اور بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک کی طرف مسلمانوں کی توجہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ بھاری اکثریت تو گویا اس کے وجود ہی سے بے خبر ہے، جب کہ وہ حدیث جس میں ارکان اسلام کا ذکر ہے خوب شہرت رکھتی ہے۔ بلکہ تقریباً ہر مسلمان کے ذہن میں اس کا مفہوم موجود ہے۔ جبکہ دونوں احادیث مبارکہ میں پانچ پانچ باتوں ہی کا ذکر ہے، جب کہ ارکانِ اسلام والی حدیث تو خبر یہ اور یہ حدیث امر (حکم) کی صورت میں ہے۔

ہماری اس محرومی کی وجہ یہ ہے کہ جب نظام خلافت ختم ہوا تو اس کے بعد ملوکیت آ گئی۔ ملوکیت دو طرح کی آئی۔ پہلے مسلمانوں کی ملوکیت آئی، اس کے بعد غیر مسلموں کی ملوکیت۔ چنانچہ بلاد اسلامیہ کے اکثر حصے مغربی اقوام کی غلامی میں آ گئے۔ ہم برِاعظم پاک و ہند کے مسلمان انگریزوں کے غلام تھے۔ غلامی کے دور میں نماز روزہ تو چلتا رہا۔ لہٰذا اس کا تصور تو ذہنوں میں موجود رہا، جب کہ جہاد وقتال، انقلاب اور اقامت دین ذہنوں سے نکلتے چلے گئے۔ اور پھر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی کیفیت پیدا ہو گئی۔

(خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا) بہر حال انقلابی جدوجہد کے دوسرے مرحلے میں ''جماعت'' کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس جماعت کا نظم بھی فوجی انداز کا مقرر کیا گیا ہے کہ افسر جو حکم دے اسے سنو اور مانو۔ تمہیں یہ حق نہیں کہ اس سے پوچھ سکو کہ یہ حکم کیوں دے رہے ہو، اس حکم کی حکمت اور غرض وغایت کیا ہے، جو حکم تم دے رہے ہو وہ معقول بھی ہے یا نہیں، آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ پہلے مجھے سمجھاؤ تب میں حکم مانوں گا۔ اگر کسی فوج میں سوال جواب کا یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو پھر وہ فوج کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔[22] گویا اس جماعت کو سمع وطاعت کا خوگر ہونا چاہیۓ۔ اسی کی یاد دہانی کراتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ (المائدہ: ۷) ''(یعنی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' سورۂ بقرہ کی آخری آیت سے پہلے کی آیت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ (آیت: ۲۸۵)

''اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ ہم تیری بخشش کے طلبگار ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

قرآن حکیم میں آپ کو سمع وطاعت کی اصطلاح بار بار ملے گی۔ یہ دونوں اصطلاحات گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ کیونکہ کسی انقلابی جماعت کا ان کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[23]

نظم جماعت کی بنیاد......بیعت

محمد رسول اللہ ﷺ نے نظم جماعت کو بیعت کی بنیاد پر استوار کیا۔ خود قرآن مجید میں سورۂ فتح آیت نمبر ۱۰ میں بھی بیعت کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا: [۲۴]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ﴾

''(اے نبیؐ!) بیشک جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں وہ تو اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

عام طور پر بیعت لینے کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ جو شخص بیعت کرتا ہے اس کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی ہے اس کا ہاتھ نیچے ہوتا ہے۔ اس آیت میں بتایا یہ جا رہا ہے کہ بیعت کرتے ہوئے ایک ہاتھ آپ کا ہے، ایک بیعت کرنے والے کا ہے اور ایک تیسرا ہاتھ بھی ہے جو اللہ کا ہے مگر وہ نظر نہیں آتا۔ یہ اللہ کا ہاتھ اس لیے ہے کہ جو سودا (بیعت) ہو رہا ہے وہ دراصل اللہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

سورۂ توبہ میں ''بیع وشراء'' دونوں الفاظ اپنی پوری جامعیت کے ساتھ اطاعت کلی کے قول وقرار اور عہد و پیمان کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (التوبہ: ۱۱۱)

''یقیناً اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے یہ پختہ وعدہ ہے تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں بھی۔ بھلا اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ تو خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے کیا ہے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔''

رہا یہ سوال کہ اس دنیا میں یہ فروخت شدہ جان و مال اللہ کے دین کے غلبے اور نظام خلافت کو برپا کرنے میں کیسے لگانا ہے؟ تو ظاہر بات ہے کہ کسی نظم جماعت ہی کے تحت سے لگانا ہوگا، اور اس نظم جماعت کا جو صاحب امر ہے اس کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت کرنی ہوگی۔ اس تو صاحب امر حضرت محمد ﷺ خود تھے اور بنفس نفیس موجود تھے، لہٰذا آپ ﷺ ہی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ اگرچہ حضور ﷺ کو بیعت لینے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ آپؐ رسول اور نبی تھے اور آپؐ پر ایمان لانے والا ہر شخص آپ کی اطاعت کا پابند تھا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (النساء: ۶۴) (ہم نے کوئی رسول بھیجا ہی نہیں مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰) (جو رسول کی اطاعت کرے گا تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' [۲۵]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپؐ بیعت کے بغیر بھی مطاع تھے تو آپؐ نے بیعت کیوں لی؟ کیا نعوذ باللہ آپؐ نے ایک بے ضرورت کام کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، وجہ یہ ہے کہ اگر آپؐ بیعت نہ لیتے تو بعد میں آنے والوں کے لیے اسوہ کہاں سے آتا! اس لیے کہ اب آپؐ کے بعد کوئی نبی تو آنے والا نہیں ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی آئیں گے تو نبی کی حیثیت میں نہیں آئیں گے۔ وہ تو نماز کی امامت بھی نہیں کرائیں گے اور امامت کرنے کی دعوت کے جواب میں کہیں گے ''امامکم منکم'' (تمہارا امام تمہی میں سے ہوگا)۔ چنانچہ اب خلافت کے قیام کے لیے جو بھی جماعت بنے گی وہ اسوۂ رسول پر ہی بنے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کا اسوہ اسی لیے چھوڑا ہے کہ یہ امت مسلمہ کی ضرورت تھی۔ اس بیعت کا ذکر کئی احادیث مبارکہ میں بھی موجود ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وہ شعر نقل کیا ہے جس میں اس بیعت کا ذکر ہے، اور جو صحابہ رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب میں بطور رجز خندق کھودتے ہوئے پڑھ رہے تھے:

نحن الذين بايعوا محمدا

على الجهاد ما بقينا ابدا

''ہم وہی تو ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے زندگی کی آخری سانس تک جہاد جاری رکھنے کی بیعت کی ہے۔''

ایک اور حدیث مبارکہ میں اس بیعت کا ذکر نہایت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس حدیث مبارکہ میں ایک اسلامی جماعت کا پورا دستور موجود ہے۔ حدیث کا متن اس طرح پر ہے:

((عن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ قال: بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره و على اثرة علينا و على ان لا ننازع الامر اهله وعلى ان نقول بالحق اينما كنا لا نخاف في الله لومة لائم- وفي رواية وان لا ننازع الامر الا ان تروا كفرا بواحا عندكم فيه من الله برهان)) (متفق علیہ)

''عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی، خوشی اور ناخوشی، ہر حالت میں، حتیٰ کہ اپنے اوپر کسی کو ترجیح دینے کے باوجود سمع وطاعت کی بیعت کی، اور اس بات پر بیعت کی کہ اہل حکم (اولوالامر) سے اختیارات کے معاملے میں نزاع نہ کریں گے، اور حق بات کہیں گے جہاں بھی ہوں، اللہ کے معاملے میں (یعنی خدالگتی کہنے میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہم اہل امر سے نزاع نہیں کریں گے، الّا یہ کہ تم (ان کے اندر) کھلا کفر دیکھو جس پر تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو۔''

اسلامی اجتماعیت کے تقاضے

یہ بیعت جہاد اور بیعت تنظیم کا نقشہ ہے جو اس حدیث مبارکہ میں دیا گیا ہے۔ یہ پیری مریدی والی بیعت نہیں ہے جسے ہمارے ہاں بیعت ارشاد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن حسرت وافسوس کی بات ہے کہ ان واضح احادیث کی موجودگی میں بھی ہماری مذہبی جماعتوں نے بیعت کے اس نظام کو اختیار نہیں کیا۔ ان کے ہاں بھی وہی ممبری اور الیکشن کا نظام رائج ہے جو غیروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ جب کہ اس نظام میں بے شمار فتنے پیدا ہونے کا تجربہ ہو چکا ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظم عطا کیا ہے وہ تمام فتنوں کا سد باب کر دیتا ہے۔

ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ اگر آپ واقعتاً انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کسی حکم کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تعمیل مشکل ہے، یا میرے حالات تعمیل حکم کی اجازت نہیں دیتے، یا یہ کہ میرا ''موڈ آف'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت میں فی العسر والیسر اور فی المنشط والمکرہ کے الفاظ شامل کیے، کہ آسانی ہو یا دشواری، تنگی ہو یا سہولت، طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو، حکم بہر صورت بجالانا پڑے گا۔

انقلابی جماعت سے تعلق رکھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں حکم یا فیصلہ اس لیے نہیں مانوں گا کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا، یا مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، یا یہ حکم میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ اجتماعی فیصلوں اور احکام میں سب کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد اختلاف رکھنے والوں کو بھی فیصلے پر عمل کرنا ہوگا۔ چنانچہ غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینے میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی اتفاق سے یہی تھی، خواہ اس کی رائے کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے جوش وجذبہ کو دیکھ کر فیصلہ فرما دیا کہ مقابلہ کھلے میدان میں ہوگا۔ یہ اجتماعی فیصلہ تھا لہٰذا جماعتی نظم کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ سب اسی پر عمل کریں۔ مگر عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھ تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے کہا کہ جب ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم اپنی جانوں کو کیوں خطرے میں ڈالیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی گئی تھی اس میں اس فتنے کا سد باب بھی کر دیا گیا ہے اور فی المنشط والمکرہ کے الفاظ کو بیعت میں شامل کر کے یہ طے کر دیا گیا کہ کسی کی طبیعت آمادہ ہو یا اس کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے اجتماعی فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا۔ اطاعت امیر ہر حال میں کرنی ہوگی۔

لفظ ''منشط'' نشاط سے بنا ہے۔ یعنی خوشدلی کی حالت میں آپ کو جو حکم دیا جائے گا اور آپ کی اپنی رائے بھی جس حکم سے ہم آہنگ ہوگی تو ظاہر ہے کہ آپ اس حکم یا فیصلے پر خوش دلی سے عمل کریں گے۔ اگر صورتِ حال برعکس ہے اور آپ کی رائے مختلف ہے تو آپ کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے گا۔ ان دونوں حالتوں میں حکم یا فیصلہ بہر حال ماننا ہوگا۔

اس حدیث مبارکہ میں جماعتی زندگی میں نمودار ہونے والے ایک اور بہت بڑے فتنہ کا سد باب بھی کر دیا گیا ہے۔ اور وہ فتنہ ہے کہ جس کو امیر مقرر کیا گیا ہے کوئی شخص یہ سمجھ بیٹھے کہ میں اس امیر سے زیادہ اہل ہوں۔ مثلاً یہ خیال کرے کہ یہ شخص تو ابھی جماعت میں نیا داخل ہوا تھا۔ جماعت کے ساتھ میری وابستگی پرانی ہے۔ میری قربانیاں زیادہ ہیں۔ لیکن بیعت کے الفاظ میں اس فتنے کا سد باب ان الفاظ میں کر دیا گیا وعلی اثرۃ علینا (یعنی ہم سمع وطاعت کے پابند رہیں گے خواہ ہم پر کسی اور کو (ہمارے خیال کے مطابق بیجا) ترجیح بھی دی گئی ہو۔ اسی لیے آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

((من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی))

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

ہم سیرۃ نبویؐ میں دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ کو لشکر کا سردار مقرر کر دیا۔ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے۔[۲۶] حالانکہ اس لشکر میں حضور کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن طالبؓ بھی تھے جو خاندان بنو ہاشم کے چشم وچراغ ہیں۔

پھر غزوۂ موتہ کے شہداء کا انتقام لینے اور قیصر روم سے جنگ کے لیے آپ نے اپنی حیات مبارکہ کا جو آخری لشکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اس کا سردار حضرت زید کے بیٹے اسامہ کو مقرر کیا۔ ان کے والد موتہ کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسے اکابر صحابہ بھی شامل تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو لشکر کا سردار بنایا۔ (۲۷) اس عملی نمونہ کے علاوہ آپ نے ایک حکم کے ذریعہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ اگر کوئی کن کٹا حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو۔

یہ ہے وہ صاف سیدھا نظم جماعت جو ہمیں احادیث نبویہ سے ملتا ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی سرے سے موجود ہی نہیں۔ چنانچہ ہم سیرت مطہرہ میں دیکھتے ہیں کہ غزوۂ احد کے موقع پر حضور ﷺ نے پشت کے درے پر پچاس تیر انداز مقرر کیے تھے۔ آپ کا حکم یہ تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور پرندے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ہلنا۔ لیکن جب ابتدائی فتح ہو گئی تو تیر اندازوں میں سے ۳۵ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مقامی کمانڈر آخر وقت تک ان سے کہتے رہے کہ تم کو یہاں سے ہلنے کی اجازت نہیں۔ بہر حال تیر اندازوں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) پہاڑی سے گھوم کر درے کی طرف سے آئے اور مسلمانوں کی پشت پر سے حملہ کر دیا۔ چنانچہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی اور ستر صحابہ ؓ نے جام شہادت نوش کیا۔

یہ اس انقلابی دعوت کا دوسرا مرحلہ ہے۔ پہلا مرحلہ مردان کار کی فراہمی۔ یہ فراہمی دعوت ایمان بذریعہ قرآن ہو گی۔ دعوت قبول کرنے والوں کو جوڑنا ہو گا۔ اینٹیں علیحدہ علیحدہ نہیں ہوں گی۔ دیوار میں لگیں گی تب فصیل بنے گی۔ پھر اینٹیں بھی پختہ ہونی چاہئیں اور ان کو جوڑنے والا مصالحہ بھی مضبوط ہونا چاہیے، یہ مصالحہ یا مضبوط سیمنٹ نظام بیعت ہے جو آپ ؐ نے دیا ہے۔

بہر حال نظم جماعت کے دوسرے طریقوں کو میں حرام نہیں کہتا۔ دوسرے طریقے بھی مباح ہیں لیکن مسنون اور ماثور طریقہ صرف بیعت ہے۔ یہ ہماری بڑی محرومی ہے کہ ہم نے اس طریقے کو چھوڑ کر غیروں کے طریقے مستعار لے لیے ہیں۔ بقول شاعر:

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے

ہم نے، الحمد للہ، مسنون طریقہ ہی کو اختیار کیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اب حضور ﷺ کے بعد جس کی بیعت ہو گی اس کی اطاعت مطلق نہیں ہو گی۔ حضور ﷺ کی اطاعت البتہ مطلق تھی۔ آپ ؐ کا ہر حکم واجب العمل ہے، اس لیے کہ آپ ؐ کوئی غلط حکم دے ہی نہیں سکتے تھے، آپ ؐ معصوم تھے۔ لیکن آپ ؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اطاعت بھی مطلق نہیں ہے۔ اب جس کی بھی بیعت ہو گی ''اطاعت فی المعروف'' کی قید کے ساتھ ہو گی۔ امیر کا حکم جو شریعت کے دائرے میں ہو وہی مانا جائے گا۔ چنانچہ ہم نے تنظیم اسلامی کے دستور میں بیعت کا جو نظام رکھا ہے اس میں ''فی المعروف'' کا اضافہ کر کے بیعت کے الفاظ اس طرح کر دیے ہیں۔ ''ابایعک علی السمع والطاعۃ فی المعروف'' ان دو الفاظ کے علاوہ باقی الفاظ بیعت وہی ہیں جو اس حدیث مبارکہ میں آئے ہیں۔

ہم نے انقلابی جدوجہد کے جن دو مراحل کا اب تک ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں ان کو خوبصورتی سے سمو دیا ہے:

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

(نشۂ درویشی کے ساتھ راہ پیدا کرو اور مسلسل جدوجہد جاری رکھو۔ جب پختہ ہو جاؤ تب سلطنت جم پر ٹوٹ پڑو)۔ یہ دعوت و تبلیغ بھی درویشوں کا کام ہے۔ اسی طرح تربیت و تزکیہ کا عمل بھی درویشی کا عمل ہے۔ تنظیم کے ساتھ پوری طرح چمٹ جانا یہ سب سے بڑی درویشی ہے۔ اس لیے کہ اس میں نفس کو سب سے زیادہ مارنا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے کا حکم ماننا کوئی آسان کام ہے!! حضور ﷺ کے عہد میں ''منافقت'' کا رویہ اپنانے والوں میں ایک بڑی تعداد کی بیماری یہی تھی کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گراں گزرتی تھی۔ آپ ؐ انہیں کہتے کہ قتال کے لیے نکلو تو وہ کہتے کہ قتال کے حکم پر مبنی کوئی آیت کیوں نہیں نازل ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کا پردہ چاک کرنے کے لیے سورۂ محمد میں آیت محکمہ بھی نازل کر دی۔ مگر ان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیوں مانیں؟ کہتے تھے کہ بس قرآن کی بات مانیں گے۔ یہ فتنہ آج بھی موجود ہے کہ ''حسبنا کتاب اللہ''[۲۸] بات وہی ہے کہ کسی دوسرے کا حکم کیوں مانیں۔ یہ سب نفس امارہ کی شرارت ہے۔ اسی لیے عرض کر رہا ہوں کہ کسی کی اطاعت کرنے میں چونکہ نفس امارہ کو مارنا پڑتا ہے، اس لیے خود کو کسی کی اطاعت کا خوگر بنانا ''تزکیۂ نفس'' کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

درویشی کے چار عناصر

گویا چار کام مسلسل کرتے رہنا ہیں۔ان چار کاموں سے درویشی کے چار عناصر پورے ہوجاتے ہیں۔

i) پہلا کام یہ کہ ''دعوت ایمان بذریعہ قرآن'' مسلسل جاری رکھو۔

ii) دوسرا کام یہ کہ قرآن ہی کے ذریعے تزکیہ کا عمل بھی مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

iii) تیسرا کام یہ کہ اپنے آپ کو نظم کا خوگر بنالو۔ سمع وطاعت کی روش کو مسلسل پروان چڑھاتے رہو۔

iv) چوتھا عنصر یہ کہ ہر قسم کے اشتعال دلانے کے مقابلے میں صبر سے کام لو۔ نہ تو مشتعل ہو، نہ مایوس ہو، کہ دعوت انقلاب ترک کردو۔ نہ طاقتور کے سامنے جھک جاؤ۔ بلکہ اس حد تک صبر سے کام لو کہ کوئی گالی بھی دے تو جواب میں گالی نہ دو۔ کوئی پتھر مارے تو صبر سے کام لو اور اس کے حق میں دعا کرو کہ اے اللہ! اس کو ہدایت دے۔ اس لیے کہ ''فانھم لا یعلمون'' وہ نہیں جانتے (کہ وہ کیا کر رہے ہیں)۔

صبر میں ایسا مقام بھی آسکتا ہے کہ تمہارے جسم کے ٹکڑے اڑا دیے جائیں، لیکن تم کو یہ سب کچھ جھیلنا ہے۔ خواہ کتنا ہی تشدد کیا جائے مگر تمہاری طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ سیرۃ مطہرہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکے میں بارہ سال تک یہی عمل جاری رہا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید بھی کر دیا گیا لیکن کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی۔ حالانکہ اس وقت مکہ مکرمہ میں چالیس صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ بزدل نہ تھے۔ پھر بدلہ نہ لینے کی وجہ کیا تھی؟ ابو جہل کا ہاتھ کیوں نہ روکا گیا؟ محض اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے طاقت کے استعمال کی اجازت نہ تھی، حکم یہ تھا کہ ''کفوا ایدیکم'' ''اپنے ہاتھ روک رکھو''، بقول اقبال:

نغمہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

فی الحال ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وقت آنے پر تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں گے۔ اس مرحلے کے آنے سے پہلے اپنے اندر سرِ تسلیم خم کرنے کی خو کو پروان چڑھانا ہوگا۔ یہ چار کام وہ ہیں جنہیں علامہ اقبال نے ''با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن'' میں سمودیا ہے۔ ان چار مراحل سے گزرنے کے بعد وہ مرحلہ آئے گا کہ جسے علامہ اقبال نے ''چوں پختہ شوی، خود را بر سلطنت جم زن'' سے تعبیر کیا ہے۔

حق و باطل کا تصادم

جب یہ لوگ آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر کندن بن جائیں، تب نظام باطل کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ اس تصادم کے بغیر نظام نہیں بدلا کرتے۔ یہ انقلابی جدوجہد کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں تصادم ناگزیر ہے۔ نظامِ باطل ٹھنڈوں پیٹوں تو حق کو برداشت نہیں کرے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ تصادم کے بغیر کبھی نظام نہیں بدلا۔ امریکی قوم نے اپنے ہاں سے غلامی کی لعنت ختم کرنے کے لیے کتنا خون دیا۔ پہلے افریقہ سے آزاد لوگوں کو قیدی بنا بنا کر لایا گیا اور ان کو غلام بنالیا گیا۔ جب یہ طے ہوا کہ اب آدم ذرا خود شناس اور خودنگر ہو گیا ہے اس لیے اب ان کو غلام نہیں رکھا جاسکتا، ان کو آزاد کرنا ہوگا تو اس مسئلہ پر پوری امریکی قوم تقسیم ہوگئی۔ نتیجتاً خانہ جنگی ہوئی، اور غلامی ختم کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کو ہر طرح کی قربانی دینی پڑی۔

بہرحال نظام بدلنے کے لیے ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر یاد آرہا ہے، جو انہوں نے نجانے کس کیفیت میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں:

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ میرا پیدا کردہ یہ جہاں تمہارے ساتھ سازگاری کر رہا ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں، سازگاری نہیں کر رہا، تو اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا کہ اسے درہم برہم کردو۔ توڑنے اور درہم برہم کرنے کا یہ عمل کیسے ہوگا؟ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنی نظم کے اگلے شعر میں بیان کیا ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

(نشہ درویشی سے راہ پیدا کرو اور مسلسل جدوجہد جاری رکھو، (پھر) جب پختہ ہوجاؤ تو خود کو سلطنت جم سے ٹکرادو)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا ۱۲ سالہ دور اس شعر کے پہلے مصرے کی تشریح بن سکتا ہے۔ دیکھیے ! اس دور میں دعوت وتبلیغ کا کام مسلسل جاری ہے۔ اس عمل دعوت کے دوران گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جارہی ہیں اور پتھروں کے جواب میں پھول برسائے جارہے ہیں۔ مکی دور میں کسی جوابی کارروائی کا سراغ نہیں ملتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ تزکیہ کا عمل بھی جاری ہے۔ دن اگر تبلیغ ودعوت کے لیے وقف ہے تو راتیں اللہ کے حضور کھڑے ہوکر گزاری جارہی ہیں۔ سورۃ مزمل میں ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ﴾ (آیت: ۲۰)

''یقیناً آپؐ کا رب جانتا ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھ جو لوگ ہیں ان میں سے بھی ایک گروہ (کبھی) دو تہائی رات، (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) ایک تہائی رات سے نمازِ تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

پھر دعوت اور تزکیہ کے اس عمل سے گزر کر جب اہل حق پختہ ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ کی "Base" عطا فرما دیتا ہے۔ نبیؐ تو اس Base کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے تھے، مگر طائف سے آپؐ ناکام لوٹے۔ طائف میں آپؐ پر پتھراؤ کیا گیا۔ جسم اطہر لہولہان ہو گیا۔ ایسے ایسے فقرے اور جملے سننے کو ملے جو تیروں کی مانند کلیجے کے پار ہو جانے والے تھے۔ چنانچہ طائف والے تو محروم رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت اہل یثرب کے لیے لکھ دی۔ وہ مدینہ جہاں آپؐ خود تشریف بھی نہ لے گئے تھے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھڑکی کھل گئی۔ لوگ خود چل کر آئے۔ پہلے سال چھ، دوسرے سال بارہ اور تیسرے سال بہتر (۷۲) لوگ آئے۔ ان میں ۷۰ مرد اور دو عورتیں تھیں۔ اس کے بعد ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور ہجرت کے بعد تصادم کا آغاز ہوا۔ ہجرت اور تصادم کا یہ مرحلہ سیرۃ مطہرہ میں پختگی کے بعد آیا۔ انقلاب برپا کرنے والے لوگ خود پختہ سیرت و کردار کے مالک ہونے چاہئیں۔ وہ صداقت وامانت کے پیکر ہوں گویا اپنی ذات پر نظام خلافت قائم کر چکے ہوں۔ یہ پہلا مرحلہ ہوگا، بقول اکبر آلہ آبادی مرحوم: ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ منظم ہو کر ایک امیر کے حکم پر حرکت کریں۔ بڑھنے کا حکم ہو تو بڑھیں۔ رکنے کا حکم ملے تو وہیں رک جائیں۔ اس کے بعد جا کر کہیں تصادم کا مرحلہ آتا ہے۔

دوطرفہ انقلابی جدوجہد کا اگلا مرحلہ تصادم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں یہ دوطرفہ مرحلہ تصادم کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ اس مرحلہ کا آغاز ہجرت کے بعد نبیؐ کی طرف سے ہوا۔ مکہ والوں کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس مرحلے میں مسلح جنگ ہوئی۔ سورۃ توبہ کی آیت کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف﴾ (آیت: ۱۱۱)

''اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

یہ گویا دوطرفہ مسلح تصادم ہے، جس میں قتل کیا بھی اور قتل ہوئے بھی۔ ہم سیرت طیبہ میں دیکھتے ہیں کہ بدر کی جنگ میں ستر قریشی مارے گئے، جب کہ تیرہ صحابی رضی اللہ عنہم موقع پر شہید ہوئے اور چودہویں صحابی شدید زخمی تھے۔ وہ مدینہ جاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاہم غزوۂ احد میں معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ اس غزوہ میں ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔

دور حاضر میں تصادم کا مرحلہ

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ دور حاضر میں تصادم کا یہ مرحلہ کیسے آئے گا۔ جہاں تک پہلے مرحلے کا تعلق ہے تو اس کو کسی تبدیلی کے بغیر لے کر چلنا ہے۔ کسی تغیر و تبدل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ وہ مرحلہ یہ ہے کہ قرآن پڑھو اور پڑھاؤ۔ قرآن کی دعوت کو عام کرو۔ قرآن کے ذریعے ایمان حاصل کرو اور اسے قلب وذہن میں گہرے سے گہرا اتارتے چلے جاؤ۔

دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف اتنا فرق واقع ہو جائے گا کہ امیر کی اطاعت صرف ''معروف'' میں ہوگی، اس لیے بیعت میں سمع وطاعت کے ساتھ ''فی المعروف'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

البتہ تیسرے مرحلے کو ہم جوں کا توں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ اس مرحلے میں ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے، اور اس تبدیلی کا تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد سے کام لیا جائے۔

نبیؐ کے دور اور آج کے حالات میں فرق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے حالات اور آج کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا ہے۔ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس لحاظ اب ۱۳۷۱ برس بیت چکے ہیں (خطبے کے وقت تک)۔ چنانچہ حضور ﷺ اور آج کے حالات میں جو فرق واقع ہوگیا ہے اس کا ادراک ضروری ہے۔ اگر حالات مرور زمانہ کے باوجود جوں کے توں رہتے تو اجتہاد کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج کی پیروی جوں کی توں کرنی ہوتی۔

بہر حال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس وقت کے حالات میں دو تبدیلیاں تو منفی نوعیت کی ہیں۔ جب کہ ایک تبدیلی مثبت اعتبار سے واقع ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی تبدیلیوں سے ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

ایک منفی تبدیلی تو یہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کا واسطہ کھلے کافروں سے تھا، جبکہ آج اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے والے کوئی اور نہیں خود مسلمان ہیں۔ ۲۹ نظام خلافت کے برپا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی مسلمان ہیں۔ مصر میں حسنی مبارک...... مسلمانوں کے ساتھ، شام میں حافظ الاسد اخوان کے ساتھ، اسی طرح الجزائر میں مسلمان فوجی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں نظام مصطفیٰ کی تحریک پر گولیاں چلانے والے بھی مسلمان ہی تھے۔ گویا حالات میں یہ بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ آج نظام خلافت کو برپا کرنے کے لیے پہلے ان نام نہاد مسلمانوں سے ٹکر لینا پڑے گی۔ اس کے بعد کہیں جا کر معاملہ کفار کے ساتھ ہوگا۔

حضور ﷺ کے عہد مبارک اور ہمارے دور میں ایک اور تبدیلی یہ واقع ہوگئی ہے کہ آپؐ کے عہد مبارک میں کوئی باقاعدہ حکومت اور Standing Army نہیں تھی گویا مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے تھا، تلواروں کا تلواروں سے، نیزوں کا نیزوں سے، گھوڑوں کا گھوڑوں سے اور اونٹوں کا اونٹوں سے تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو تعداد کا تھا۔ آپ نفری کے فرق کے ساتھ ساتھ اسلحہ کے فرق کو بھی پیش نظر رکھیں تو بھی زیادہ سے زیادہ ایک اور سو کی نسبت بنے گی، اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ آج معاملہ ہی کچھ اور ہوگیا ہے۔ اس وقت جو نظام سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ، اور ملوکیت پر مبنی موجود ہیں، ان نظاموں کے چلانے والوں کے مفادات ان سے وابستہ ہیں۔ وہ ان نظاموں سے بے پناہ مراعات حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی مراعات اور مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے پاس مستقل افواج (Standing Armies) موجود ہیں۔ یہ مستقل فوجیں، پیرا ملٹری فورس، پولیس اور ائیر فورس پر مشتمل ہیں۔ برسر اقتدار مفاد پرست طبقات باغیوں کو کچلنے کے لیے ائیر فورس کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ خود ہمارے ملک کے اندر بلوچستان میں ائیر فورس استعمال کی جا چکی ہے۔ اسی طرح حافظ الاسد نے ائیر فورس کے ذریعے ''حمص'' کے شہر کو تہس نہس کر دیا تھا جو کہ الاخوان المسلمون کا مرکز بن گیا تھا۔ لہٰذا ان دو منفی تبدیلیوں کی وجہ سے مقابلہ بہت ہی غیر مساویانہ ہوگیا۔

تاہم ان دو منفی تبدیلیوں کے علاوہ ایک مثبت تبدیلی بھی ہوئی ہے۔ وہ مثبت تبدیلی یہ ہے کہ رسالت مآبؐ کے ایک ہزار سال بعد تک بھی انسان کا عمرانی شعور اس سطح تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ ریاست اور حکومت میں فرق کر سکے۔ آج انسان کا عمرانی شعور یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ وہ ریاست کو الگ شے سمجھتا ہے اور حکومت کو ریاست کا محض ایک عنصر گردانتا ہے۔ حکومت دراصل ریاستی امور کو چلانے کا ایک ادارہ ہے۔ شہریوں کی وفاداری ریاست کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے ساتھ، بلکہ حکومت کو تبدیل کرنا شہریوں کا حق ہے۔ یہ ایک عظیم فرق ہے۔ اس فرق کے اثرات و نتائج کا اچھی طرح ادراک کر لینا ضروری ہے۔

عمرانی ارتقاء سے پیدا ہونے والے اس فرق کو اگر سامنے رکھا جائے تو اب مسلح تصادم کے مرحلہ کا متبادل بھی موجود ہے۔ میں مسلح بغاوت (یعنی خروج) کو حرام ہرگز نہیں سمجھتا۔ امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ موجود ہے کہ یہ جائز ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کے لیے کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ ان کا کہنا یہی ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ کامیابی یقینی نظر آنے لگے۔ بحالات موجودہ ان کی یہ شرط پوری ہونا مشکل ہے۔ تاہم اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو پھر یہ مسلح بغاوت جائز ہے۔ مختلف ممالک کے حالات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پہاڑی ملک میں گوریلا جنگ کامیاب ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات اس طرح کی گوریلا جنگ کے متحمل نہیں ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے یہ چیز تقریباً محال۔ گویا اصولاً مسلح بغاوت حرام نہ ہونے کے باوجود عملاً قابل عمل (Feasible) نہیں ہے۔

حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے

اس وقت دنیا میں حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ انتخابات کا ہے۔ چنانچہ آپ ووٹ کی طاقت سے حکومت تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے حوالے سے ہم تفصیلاً بحث کر چکے ہیں کہ اس ذریعے سے چہرے تبدیل کیے جا سکتے ہیں، نظام ہرگز نہیں بدلا جا سکتا۔ جبکہ ہمیں چہرے نہیں نظام بدلنے کی ضرورت ہے۔ انتخابات کے انعقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ موجود الوقت نظام کسی طرح زیادہ بہتر انداز میں چلایا جائے۔

دوسرا طریقہ ایجی ٹیشن کا ہے۔ اس طریقے سے کامیابی تب ممکن ہے کہ تیاری مکمل ہو۔ اگر لاکھوں افراد سر پر کفن باندھ کر نکلنے پر تیار ہوں تو کامیابی یقینی ہے۔ اسے ہم مظاہراتی طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مظاہرہ تو وہ ہے جسے ہم ''خاموش مظاہرہ'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری دعوت وتبلیغ ہی کا ایک طریقہ ہے۔ تاہم نظام بدلنے کے لیے جو مظاہرہ ہوتا ہے اس کے ذریعے تو باطل نظام کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ یہ مظاہرہ گھیراؤ کے ساتھ ہوگا کہ اس نظام کو اب چلنے نہیں دیں گے۔ ''ترک موالات'' کی تحریک بھی اسی کا ایک حصہ ہوگی۔ یعنی اب ہم نظام باطل کو ٹیکس نہیں دیں گے۔ بینکوں کو چلنے نہیں دیں گے اور جاگیر داروں کو ان کا حصہ نہیں دیں گے۔

کوئی انقلابی تحریک جب اس مرحلے میں داخل ہو جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل نظام اس کے راستے میں مزاحم ہوگا۔ اب اس جماعت کے کارکنوں پر گولیاں بھی برسائی جائیں گی اور ان کو جیلوں میں ٹھونسا جائے گا۔ لیکن یہ سارا تشدد یکطرفہ ہوگا دوطرفہ نہیں، جبکہ سیرت نبویؐ میں یہ جنگ دوطرفہ تھی۔ لیکن یہاں اسلامی انقلابی تحریک کے کارکن کسی کو قتل نہیں کریں گے، بلکہ خود قتل ہونے کے لیے تیار ہو کر میدان میں آئیں گے۔

نظام کی تبدیلی کے لیے خون

یہ بات ایک سے زائد بار کہی جا چکی ہے کہ رائج الوقت نظام خون دیے بغیر نہیں بدلتا۔ اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ دین بھی غالب ہو جائے اور خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہے تو یہ محض خام خیالی ہے۔ اگر یہ کام خون دیے بغیر ہو سکتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے کئی سو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جانوں کا نذرانہ پیش نہ کرتے، جبکہ ہمارا یقین یہ ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان ہم جیسے لاکھوں انسانوں کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے رفقاء کی قربانیاں دی ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ نے ''اسد اللہ واسد رسولہ'' کا خطاب عطا فرمایا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینے میں پہنچنے والے پہلے معلم قرآن ہیں۔ انہی کی محنت سے مدینہ میں انقلاب کے لیے زمین ہموار ہوئی تھی۔

نہی عن المنکر کے تین مدارج

اب میں آپ کے سامنے نہی عن المنکر کے حوالے سے دو احادیث مبارکہ پیش کر رہا ہوں۔ ایک حدیث تو وہی ہے جو میں نے خطبہ کے آغاز میں پڑھی تھی۔ یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ صحیح مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان))۔

''تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے بدل دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اسے برا کہے اور) اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

گویا اگر برائی سے دلی نفرت بھی نہیں اور اس کو بدلنے کا دل میں ارادہ بھی نہیں تو پھر ایسے شخص کے دل میں ایمان ہی نہیں ہے۔

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک طاقت نہیں ہے ''نہی عن المنکر باللسان'' کا فریضہ ادا کیا جاتا رہے۔ چنانچہ ہم زبان سے کہتے رہیں گے کہ یہ حرام ہے، یہ جاگیر داری، یہ سودی نظام جائز نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ جب طاقت حاصل ہو جائے گی تب نظام باطل کو میدان میں چیلنج کیا جائے گا، یعنی ''نہی عن المنکر بالید۔''

یہی مضمون ایک دوسری حدیث مبارکہ میں زیادہ واضح ہو کر آیا ہے۔ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ بھی صحیح مسلم شریف کی روایت ہے:

((ما من نبى بعثه الله فى امة قبلى الا كان له فى امته حواريون واصحاب ياخذون بسنته ويقتدون بامره ثم انما تخلف بعدهم خلوف يقولون مالا يفعلون ويفعلون مالا يؤمرون فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراء ذلك من الايمان حبة خردل))

''مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کسی امت میں اٹھایا تو اس کی امت میں سے اس کے ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو اپنے نبی کی سنت کو تھامے رکھتے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے نالائق جانشین آتے جن کا حال یہ تھا کہ جو کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا۔ تو ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ (قوت وطاقت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو شخص ان سے زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو شخص ان سے دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں کڑھے) وہ بھی مومن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ایک بڑی جامع حدیث ہے۔ امتوں کے زوال کا پورا فلسفہ اس میں موجود ہے۔ اس لیے کہ قول وفعل کا تضاد ہی امتوں کو زوال سے دوچار کرتا ہے، جیسا کہ آج ہمارا حال ہو گیا ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں عشق رسولؐ کا، لیکن اتباعِ رسول ﷺ سے مکمل گریز ہے۔ البتہ بدعات وخرافات کا ایک طومار ہے کہ جس کو دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد فرض عین ہے

انقلابی جدوجہد کے تمام مراحل کو بیان کر دینے کے بعد مجھے دو باتیں مزید کہنی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نظام خلافت قائم کرنے کی جدوجہد ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے۔ یہ عین اس کے ایمان کا تقاضا ہے، ورنہ مذکورہ بالا حدیث کے مطابق وہ قول وفعل کے تضاد کا مرتکب ہو رہا ہے کہ دعویٰ تو کرتا ہے اللہ پر ایمان کا، مگر اللہ کا دین پامال ہوتے دیکھتا ہے اور اپنے کاروبار کو چمکانے میں مشغول ہے۔ اس وقت دین جس قدر مغلوب ہے اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، بقول مولانا الطاف حسین حالی:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

مولانا حالی نے مناجات بحضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا ہے:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے ۔۔۔ امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

ایک طرف دین کی پستی کا یہ عالم ہے، دوسری طرف ہماری بے غیرتی اور بے حمیتی کی کیفیت یہ ہے کہ بس اپنے کاروبار، اپنی جائیداد اور اپنے معاملات میں جتے ہوئے ہیں، ہمیں فکر ہے تو اپنی کاروں کے ماڈل کی اور اپنے ٹیلی ویژن کے اسکرین کے سائز کی۔

غلبۂ دین کی جدوجہد کو فرض عین قرار دینے کے سلسلہ میں ایک اور نکتے کا اضافہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں فقط وہیں غلبۂ دین کی جدوجہد فرض عین نہیں ہے، بلکہ اگر کہیں صرف ایک ہی مسلمان ہے تو اس پر بھی فرض ہے کہ وہ دین کے غلبے کی جدوجہد کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ ساڑھے نوسو برس کی زندگی دے تو اس ساری زندگی میں یہی کام کرتا رہے۔ یہ کام تب بھی کرنا ہے جب کوئی شخص مانے اور تب بھی کرنا ہے جب کوئی شخص نہ مانے۔ قرآن نے ہمارے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کی مثال رکھی ہے۔ وہ اللہ کا بندہ ساڑھے نوسو برس استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑا رہا ہے، مگر اس طویل محنت سے کتنے لوگ ایمان لائے؟ پھر اگر وہ کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے تو ناکام قرار پاتے مگر وہ کام کرتے رہے۔ قوم نہیں مانی تو قوم ناکام ہوتی ہے اور اپنا فرض ادا کرنے کی وجہ سے وہ خود کامیاب رہے۔

سیرت مطہرہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ کہیں اگر ایک مسلمان بھی ہے تو اس پر بھی دعوت دین اور اقامت دین فرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کام کا آغاز کیا تو آپ تنہا تھے۔ ہمارے لیے اسوۂ کاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے کہ قرآن کریم نے کہا ہے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ البتہ ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ آپؐ نے جو کام بیس برس کے مختصر عرصے میں انجام دیا اب شاید وہ کئی سو برس میں مکمل ہو۔

چنانچہ دیکھئے! یہ کام برصغیر پاک و ہند میں تقریباً چار سو سال سے انجام دیا جا رہا ہے۔ کام کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ اس کے بعد دعوت قرآنیا امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شروع کی۔ پھر پچھلی صدی میں جہاد وقتال کا نمونہ سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے دکھایا۔ یہ سارا کام تدریجاً ایک نکتے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بات میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مشیت ایزدی میں اس خطے کی کوئی خاص اہمیت ضرور ہے۔ اس لیے کہ ایک ہزار برس تک تمام مجدد دین ملت عالم عرب میں پیدا ہوئے، مگر جونہی الف ثانی (سنہ ہجری کا دوسرا ہزار) کا آغاز ہوا تو مجددیت کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہو گیا۔ گیارھویں صدی کے مجدد شیخ احمد سرہندیؒ ہیں، جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر ۔۔۔ وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے ۔۔۔ جس کے نفس گرم سے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان ۔۔۔ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے بعد، حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے جو بارھویں صدی کے مجدد ہیں۔ حضرت شاہ صاحب حقیقتاً مجدد علوم اسلامی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملت مسلمہ کو پھر سے قرآن کی طرف متوجہ کیا، جبکہ قرآن سے بے اعتنائی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ اسے صرف حصول ثواب کا ذریعہ سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ حضرت شاہ ہی کی تحریک کا اثر ہے کہ پچھلے تین سو برسوں میں قرآن حکیم پر سب سے زیادہ علمی وفکری کام برعظیم پاک وہند میں ہی ہوا ہے۔ باقی پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ نظام خلافت کا قیام اور اقامت دین کا کام تدریجاً ہوگا۔ چنانچہ دیکھئے اس وقت بیسویں صدی میں یہ کام بھرپور اور جامع تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اب اس صدی کی تیسری نسل میں یہ کام ہو رہا ہے اور کام کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت سے لوگوں کی محنت شامل ہے۔ آج سے اٹھاسی برس قبل مولانا ابوالکلام آزادؒ ۱۹۱۲ء میں حکومت الٰہیہ کا نعرہ لے کر اس ملک میں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیعت ہی کی بنیاد پر ''حزب اللہ'' قائم کی تھی۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا غلغلہ بلند کر

دیا تھا۔اس کے علاوہ نوجوان مبلغین قرآن پیدا کرنے کے لیے کلکتے میں دارالارشاد کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا، تاکہ فکر قرآنی کو عام کیا جا سکے۔گویا برعظیم پاک وہند میں بھی یہ جدوجہد کم از کم اسی (۸۰) برس پرانی ہوکر اب تیسری نسل میں داخل ہو چکی ہے۔جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک (Life Span) میں کر دیا تھا وہ اب اگر تین چار نسلوں میں مکمل ہو جائے تب بھی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے جس کام کا آغاز ۱۹۱۲ء میں کیا تھا وہ اس کو جاری نہ رکھ سکے ان کی اس بددلی کے کئی اسباب تھے، ان میں سے ایک بڑا سبب قدامت پسند علماء کا اختلاف بھی تھا۔ [۳۰]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جس کام کو چھوڑ دیا تھا اس کا بیڑا دوبارہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اٹھایا۔مولانا آزاد مرحوم نے حزب اللہ قائم کی تھی جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈالی۔اگرچہ ان سے یہ کوتاہی ہوگئی کہ انہوں نے اس کی بنیاد نظام بیعت پر نہ رکھی۔مولانا آزاد نے ایک ادارہ ''دارالارشاد'' کے نام سے قائم کیا تھا، جبکہ مولانا مودودی مرحوم نے علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند کے ذریعے ''دارالاسلام'' بنایا تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کام کو سات آٹھ سال ہی جاری رکھ سکے، جب کہ مولانا مودودی مرحوم بھی جماعت اسلامی قائم کرنے کے بعد اپنے اصولی انقلابی طریقہ کار پر سات، آٹھ سال ہی کاربند رہ سکے اور پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی کو انتخابی سیاست میں الجھا دیا۔اس طرح وہ ایک اصولی اسلامی انقلابی تحریک کی بجائے محض ایک قومی سیاسی جماعت بن کر رہ گئی اور انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس جانے کے بعد جماعت اسلامی کا انقلابی کردار ختم ہو کر رہ گیا۔

ہمارا کام

جہاں سے مولانا مودودی مرحوم نے کام کو چھوڑا تھا، اب تیسری نسل میں، وہاں سے میں نے اس کام کا آغاز کیا ہے۔میں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت دعوت قرآنی کے عام کرنے میں لگایا ہے۔گویا یہ وہی دعوت رجوع الی القرآن ہے، نوجوانوں میں قرآن کے پڑھنے اور پڑھانے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کام کے لیے انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا۔اس انجمن کے تحت متعدد قرآن اکیڈمیاں اور قرآن کالج کا قیام عمل میں آیا ہے۔قرآن اکیڈمیوں میں دوسالہ اور ایک سالہ نصابوں کے ذریعہ ایسے نوجوان تیار کیے گئے جو اس قرآنی فکر کو عام کر سکیں۔اس کے علاوہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام قرآن کانفرنسیں، قرآنی تربیت گاہیں اور محاضرات قرآنی کا انعقاد مختلف شہروں میں ہو رہا ہے۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس پیغام کو نجانے کہاں کہاں لے کر پھرا ہوں۔اس سارے پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ کام آج ہم نے نہیں شروع کیا ہے بلکہ یہ ایک مسلسل عمل کا حصہ ہے۔دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا تھا وہی کام مختلف نسلوں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

ہمارے پروگرام تین اجزاء

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اس کام کے تین حصے ہیں:

(۱) ہمارے اس کام کی جڑ اور بنیاد دعوت رجوع الی القرآن ہے۔جسے میں نے انقلابی جدوجہد کے پہلے مرحلے ''دعوت ایمان بذریعہ قرآن'' سے تعبیر کیا ہے۔اس کام کے لیے انجمن خدام القرآن قائم ہے، اور اس کے کام کی وسعت کی ایک جھلک میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ہم اپنے مختلف نصابوں اور تربیتی پروگراموں کے ذریعے ایسے نوجوان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو قرآن کو براہ راست پڑھ اور سمجھ سکیں، اور بقول اقبال نزولِ کتاب ان کے دلوں پر ہونے لگے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی [۳۱] نہ صاحب کشاف [۳۲]

قرآن حکیم کو ترجموں اور تفسیروں سے نہیں بلکہ براہ راست سمجھا جائے گویا کہ قرآن آپ کے قلب پر نازل ہو رہا ہے۔ [۳۳]

(۲) دوسرا کام ہم یہ کر رہے ہیں کہ تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی انقلابی جماعت کا قیام عمل میں آجائے۔تاکہ وہ لوگ جن کے دل نور قرآنی سے روشن ہو جائیں وہ اقامت دین کے لیے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر لیں۔تنظیم اسلامی سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت پر قائم ہے۔اقدام کا مرحلہ جب بھی آئے گا وہ تنظیم کے تحت ہی ہوگا۔کیونکہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ لوگ جمع ہو جائیں جو اپنے اوپر اور اپنے دائرہ اختیار میں دین کا نفاذ کر چکے ہوں اور مل جل کر بنیان مرصوص بن چکے ہوں۔اس تنظیم کی حیثیت درخت کے تنے جیسی ہے، جبکہ تحریک رجوع الی القرآن درخت کی جڑوں کی مانند ہے۔[۳۴] درخت کو ساری غذا جڑوں سے آتی ہے اور تنے سے گذر کر اوپر تک پہنچتی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی انقلابی جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ ہم وہ جماعت بنا چکے ہیں۔ کیونکہ بحالات موجودہ ایسی جماعت بنانا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے اذہان ہنوز انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے۔ ہماری غیرت وحمیت کچلی جا چکی ہے۔ ہمارے اخلاق کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہم لوگ وعدے کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں سمع وطاعت کی بنیاد پر جماعت بنانا آسان کام نہیں ہے۔

(۳) ہمارے کام کی تیسری سطح یہ ہے کہ نظام خلافت کے اجتماعی ڈھانچے اور اس کی برکات کو عام کیا جائے۔ یہ کام ہم تحریک خلافت پاکستان کے نام سے کر رہے ہیں۔ یہ دراصل عوام کو educate کرنے کا کام ہے۔ اس کام کے بھی دو پہلو ہیں، ایک عوامی سطح پر نظام خلافت کی برکات کے شعور کو عام کرنا۔ چنانچہ عوام کو نظام خلافت کی برکات سے آگاہ کرنے کے لیے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے جلسہ ہائے عام اور کارنر میٹنگوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تحریک خلافت کے پیش نظر کوئی فوری ہنگامہ ہرگز نہیں ہے۔ دوسری سطح نظام خلافت کے اجتماعی نظام اور درپیش جدید مسائل کو علمی انداز میں تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچانا ہے۔ یہی دوسرا کام ہے جس کے لیے خطبات خلافت کا انعقاد ملک کے تمام بڑے شہروں میں کیا گیا ہے۔ یہ بہت اہم کام ہے کیونکہ اسلام کا نعرہ لگانا تو آسان ہے لیکن جدید دستوری اور معاشی مسائل سے پنجہ آزمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تحریک خلافت میں شمولیت کے لیے ہم نے بیعت کی شرط نہیں رکھی۔ اس میں شمولیت ایک طرح کی معاونت ہے، قرآن مجید کے الفاظ میں ''تعاونوا علی البر والتقوی'' اگر آپ کو اس کام سے اتفاق ہے تو ایک فارم کے ذریعے آپ تحریک خلافت کے معاون بن جائیں۔ یہ آپ کی طرف سے معاونت کا ایک وعدہ ہے۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے آپ اپنا کچھ وقت اور صلاحیت بھی خرچ کریں گے۔ تحریک خلافت کے معاون بننے کے بعد آپ ہمیں اور ہمارے کام کو زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے۔ اس سے باہمی اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ یہ اعتماد اور جذبہ آپ کو بالآخر تنظیم اسلامی میں لے آئے گا۔ یہ بات اچھی سمجھ لینی چاہیے کہ اصل شے جس کو مضبوط کرنا ہے وہ تنظیم اسلامی ہی ہے۔

من انصاری الی اللہ؟

میں خطبات خلافت کا اختتام اس پکار پر کرنا چاہتا ہوں کہ ''من انصاری الی اللہ؟'' یعنی کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟...... میری مدد کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ تنہائی میں میرے لیے دعا کریں۔ میرے ساتھ تعاون کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ آپ انجمن خدام القرآن سے وابستہ ہو جائیں۔ میرے ساتھ تعاون کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نوجوان اپنی زندگی کا ایک سال فارغ کر کے ایک سالہ رجوع الی القرآن کے کورس میں شامل ہو جائیں اور قرآن حکیم کے علوم ومعارف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرے ساتھ تعاون کی بلند ترین سطح یہ ہے کہ آپ تنظیم اسلامی میں شامل ہو کر میرے اعوان وانصار اور دست وبازو بن جائیں۔ البتہ یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ تنظیم اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے میرے اوپر پورا اعتماد حاصل کر لیجیے۔ تنظیم میں شمولیت علیٰ وجہ البصیرت ہونی چاہیے، کسی وقتی ترنگ کی بنیاد پر نہیں۔

میرے ساتھ تعاون کا تیسرا اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آپ تحریک خلافت کے معاون بنیں۔ جن لوگوں نے چار دن مسلسل خطبات کے لیے روزانہ چار گھنٹے نکالے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ عملی نتیجہ بھی ضرور نکلنا چاہیے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم

ولسائر المسلمین والمسلمات

حواشی

۱۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان بنیادی مباحث پر مجھے سیر حاصل بحث اور گفتگو کی توفیق ہوئی اور ''خطبات خلافت'' اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ گئے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوا ہے۔ اس کائنات میں تو ایک پتا بھی اس کے اذان کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ حالات کو سازگار اور موافق نہ بنا دیتا تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس موقع پر اکبر الہ آبادی مرحوم کے دو شعر مجھے یاد آتے ہیں: ؎

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر
اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر
اسباب کرے جمع خدا ہی کا ہے یہ کام
طالب ہو خدا سے تو، دعا ہی کا ہے یہ کام

۲۔ جیسا کہ گزشتہ مباحث میں بتایا جا چکا ہے کہ نبی ﷺ نے صریح پیشینگوئی فرمائی ہے کہ قیامت سے قبل اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہوگا اور یہ قیام ہوگا بھی عالمی سطح پر (دنیا کے کسی محدود خطے میں نہیں)، البتہ اس نظام کا قیام کس وقت ہوگا؟ اس سوال کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا۔ اس لیے ہم بھی وقت کا تعین نہیں کر سکتے، تاہم اللہ کے رسول ﷺ نے جو آثار و علامات بیان فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے بیان کردہ حالات و واقعات تیز رفتار ڈرامے کی طرح یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہو رہے ہیں، اور ان واقعات کے پے بہ پے ظہور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جو خوشخبری دی ہے اس کی تکمیل کا وقت بہت قریب ہے۔

۳۔ خواہش یا عربی میں ''امنیہ'' اس طلب کو کہتے ہیں جس کے پیچھے اس کے مطابق عمل نہ ہو۔

۴۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا آپ مطالعہ کریں تو وہاں معجزات کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا وہ محنت اور مشقت جھیل کر کیا ہے۔ اس طرح گویا امت کے لیے معجزات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

۵۔ ''قنوت نازلہ'' نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھی جانے والی دعا ہے جو کسی بڑی ہنگامی مصیبت کو دور کرنے کے لیے اور دشمنانِ اسلام و مسلمین کو ناکام کرنے کے لیے پڑھنا مسنون ہے۔

۶۔ قبولیت دعا کے لازمی شرائط درج ذیل ہیں:

i) دعا پورے یقین، ایمان اور اخلاصہ کے ساتھ کی جائے۔

ii) بندہ یا تو کلی طور پر بے بس ہو یا مطلوب شے کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں اور وسائل لگا چکا ہو۔

iii) دعا حقوق اللہ اور حقوق العباد کے خلاف نہ ہو۔

iv) عذاب کا فیصلہ ہو چکنے کے بعد عذاب ٹالنے کی دعا نہ ہو (صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اس سے مستثنٰی قرار پائی)۔

ان شرائط کے ساتھ جو دعا بھی کی جاتی ہے وہ درج ذیل تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی ایک صورت میں لازماً قبول ہوتی ہے۔

الف) بندہ جو کچھ مانگ رہا ہے وہی کچھ اسے عطا کر دیا جائے۔

ب) اس سے بہتر یا اس کے مساوی کوئی شے بندے کو عطا کر دی جائے۔

ج) ''دعا'' اگر کلی مصلحت کے خلاف ہو اور قبول نہ کی جا سکتی ہو تو اس کو بندے کے اعمال نامے میں درج کر کے روز جزا میں اس کا اجر دینے کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔

۷۔ عوام اسی حقیقت کا اظہار عوامی پیرایہ میں یوں کیا کرتے ہیں:

''اللہ نے چار کتابیں اتاریں اور پانچواں اتارا ''ڈنڈا'' اور علامہ اقبال نے اپنے انداز میں کہا ہے ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد''

۸۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے: ''اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

۹۔ اس قسم کی جملہ کارروائیاں اسلام کے احکام اور قتال کے جواز کی شرائط اور حدود کے بھی خلاف ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

۱۰۔ الجزائر میں الیکشن کے ذریعے تحریک کی کامیابی سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، نہ پاکستان کے معاملے کو الجزائر پر قیاس کرنا چاہیے۔ کیونکہ الجزائر میں آزادی کے بعد سوشلسٹ نظام قائم ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہاں وہ رکاوٹ موجود ہی نہیں ہے جو پاکستان میں پہاڑ بنی کھڑی ہے۔

۱۱۔ اسلامی تحریکوں کو ناکام بنانے کے لیے یہ بھی ایک سازش کے تحت ہوتا ہے۔ اسلامی تحریک کو اس کے اصل طریقہ کار سے ہٹانے کے لیے اس پر تشدد کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ردعمل میں تحریک بھی تشدد کا راستہ اپنائے اور اس تشدد کو بہانہ بنا کر ریاستی طاقت کے ذریعے تحریک کو کچل کر رکھ دیا جائے۔

۱۲۔ اس طرح کی مسلح جدوجہد میں بھی شرعی احکام کی سختی کے ساتھ پابندی ہونی چاہیے۔ مثلاً یہ کہ ان کارروائیوں کی ذمہ داری بااختیار امیر کے ہاتھ میں ہو اور غیر مسلح لوگوں یا شہریوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

۱۳۔ بالترتیب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سورۂ حجرات کی ان آیات کا درس کئی بار دیا ہے جن میں ''ایمان'' اور ''اسلام'' کو دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ یہ مغالطہ رفع ہو جائے کہ ہم ''فی الواقع مومن ہیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں، بس ہمارے پاس ایک موروثی عقیدہ ہے۔ ایمان تو ایک بہت بڑی طاقت اور نور ہے۔ دل میں حقیقی ایمان ہو اور عمل میں ''جہاد'' نہ ہو، ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ درحقیقت ایمان کسی اور شے کا نام ہے اور اسلام کسی اور شے کا نام! چنانچہ سورۂ حجرات کی آیت (۱۴) میں ہے، یعنی یہ بدر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیں کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اسلام (فرماں برداری) کو اختیار کر لیا ہے۔ ایمان تو تمہارے دلوں میں اب تک داخل ہی نہیں ہوا ہے۔

۱۵۔ مسلم اُمہ کے اندر بصیرت کی موجودگی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اللہ کا شکر ادا کرنے کا مشہور واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار آپؓ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ سامعین میں سے ایک نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''ہم تم کو اس سے سیدھا کر دیں گے۔'' تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس قوم کی قیادت وہ کر رہے ہیں وہ قوم صاحب بصیرت ہے، اندھوں اور بہروں پر مشتمل نہیں۔

۱۶۔ اس ضمن میں بہت سی باتیں باہر سے آ کر شامل کر دی گئی ہیں۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ''سلوک'' کل کا کل قرآن ہی کے ذریعے تھا۔

۱۷۔ انسان کا باطن کس طرح شیطان کی زد میں ہے اس کا پتہ ایک حدیث مبارکہ سے چلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم)) ''یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے'' علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے: ؎

کشتن ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماق دل است

یعنی ابلیس کو مارنا سخت مشکل ہے، کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں میں گھسا ہوا ہے۔

ایک دوسری حدیث مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس ''شیطان'' کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔ حدیث اس طرح پر ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان صحابیؓ کو جنہوں نے بڑی ہمت کر کے پوچھ لیا: ''کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے ساتھ بھی کوئی شیطان ہے؟ اس سوال کے جواب سے ہمیں یہ حکیمانہ نکتہ ملا کہ ''ہاں! مگر میں نے اسے مسلمان بنا لیا ہے۔'' یہی بات اقبال نے اپنے انداز میں اس طرح کہی ہے: ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

(اسی شیطان کو مارنے سے) زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ اس کو مسلمان بنا لو اور قرآن کی تلوار سے اسے مار دو کیونکہ یہ قرآن ہی ہے جو انسان کی رگ رگ میں سما جاتا ہے۔ اور شیطان خون کے جس جس خلیے میں پہنچتا ہے وہاں قرآن بھی پہنچ کر اسے مسلمان بنا تا ہے)۔

قرآن کے اسی وصف کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی جب قرآن روح میں اتر جاتا ہے تو وہ روح ایک دوسری روح بن جاتی ہے اور جب روح دوسری ہو جائے تو عالم بھی بدل کر دوسرا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید جب کسی کے اندر سرایت کرتا ہے تو انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ اس کا فکر ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ پہلے زندگی سب سے زیادہ قیمتی شے نظر آتی تھی، مگر اب شہادت کی موت سب سے قیمتی شے نظر آنے لگتی ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہی بات دشمن کی فوج کو کہلا بھیجی تھی کہ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جن کو موت اتنی عزیز ہے جتنی تمہیں زندگی عزیز ہے۔ تم ان لوگوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو؟ بقول علامہ اقبال: ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

زندگی اور موت کے بارے میں جن کا نقطہ نظر یہ ہوا نہیں بھلا کس بات کا خوف ہو سکتا ہے!! یہی وجہ ہے کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر تین ہزار صحابہؓ نے ایک لاکھ کی فوج سے اور بعض روایات کے مطابق ہرقل اپنی ایک لاکھ فوج کے ساتھ جب آملا تو تین ہزار کا مقابلہ دو لاکھ کی منظم فوج سے ہوا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس سنگین صورت حال پر جب مشورہ کیا تو فیصلہ یہی ہوا کہ ہم تو شہادت کی تمنا میں یہاں آئے ہیں، فتح حاصل کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اسی جنگ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ یہ ہے وہ اندر کا انقلاب جو قرآن کے ذریعہ برپا ہوا تھا۔

۱۸ یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جن کو مردان کار نہیں ملے وہ انقلاب برپا نہیں کر سکے۔ ظاہر بات ہے کہ ناکام وہ انبیاء نہیں ہوئے بلکہ ان کی قومیں ناکام ہوئیں۔

۱۹ آیت ۱۲۹ اور آیت ۱۵۱ (سورۂ بقرہ)۔

۲۰ بچپن میں ہم نے اور آپ نے یہ کہانی پڑھ رکھی ہے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ لکڑیوں کے اس گٹھے کو توڑو، مگر بیٹوں میں سے کوئی بھی اس کام کو نہ کر سکا۔ مگر گٹھے کو کھول کر جب لکڑیاں الگ الگ کر دی گئیں تو بیٹوں نے بڑی آسانی سے ایک ایک لکڑی کو الگ الگ توڑ دیا۔ اس موقع پر باپ نے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو! کہ اگر تم جمع رہے تو تم کو کوئی نہ توڑ سکے گا لیکن تمہارے درمیان اگر تفرقہ پیدا ہوا تو تمہیں علیحدہ علیحدہ ہر کوئی آسانی سے زیر کر لے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ایک اکیلا اور دو گیارہ بن جاتے ہیں۔

۲۱ روایت کے مذکورہ بالا الفاظ محض تاکید مزید کے لیے ہیں، اس لیے اگر ان باتوں کا حکم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے بھی دیتے تو وہ بھی اللہ کی طرف سے ہی ہوتا، کیونکہ قرآن کہتا ہے ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ۴) (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ تو وحی ہے (ان پر) نازل کی جاتی ہے)۔

۲۲ مجھے اس موقع پر میٹرک میں پڑھی ہوئی انگریزی نظم ''چارج آف لائٹ بریگیڈ'' کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

Theirs not to reason why?
Theirs but to do and die!

حجت بازی کا یہ موقع نہیں کہ کیوں اور کیوں نہیں (وقت کا تقاضا صرف یہ ہے) کہ (حکم پر) عمل کرو اور (تعمیل میں) جان دے دو۔

۲۳ انقلابی جماعت کے تین لازمی اوصاف ہیں: (۱) وہ جماعت بالکل نئی ہو۔ (۲) اس جماعت میں شمولیت کے لیے اس کے نظریہ کو شعوری طور پر قبول کرنا ضروری ہو، پھر شمولیت اختیار کرنے کے بعد انسان اس نظریہ کے لیے جان کی بازی تک کھیل جانے کے لیے آمادہ ہو۔ (۳) اور انقلابی جماعت کی تیسری خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ''کاڈرز'' بالکل نئے ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جو کسی حوالے سے پہلے سے کسی معاشرے میں اونچا ہو وہ اس جماعت میں بھی اونچا ہی رہے۔ مثلاً معاشرے میں سید اونچا ہے لہٰذا وہ اس جماعت میں بھی اونچا متصور ہو، اور ''مسلی'' نیچ ہے لہٰذا وہ اس جماعت میں بھی نیچا ہی سمجھا جائے۔ اگر ایسا ہے تو وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس انقلابی جماعت میں جس کی جتنی زیادہ قربانی ہے۔ وہ اتنا ہی بلند ہے اس انقلابی نظریہ کے ساتھ اس کی وابستگی اور قربانی ہی کسی کا مقام متعین کرنے کی بنیاد بنے گی)۔

۲۴ سورۂ فتح کی آیت ۱۸ میں بھی بیعت کا ذکر ہے اور اس بیعت پر اللہ کی رضامندی کا اظہار ہے۔ اسی طرح سورۂ ممتحنہ کی آیت ۱۲ میں خواتین کی بیعت کرنے کا ذکر ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان خواتین سے بیعت لینے کی ہدایت ہے۔

۲۵۔ میں تو بات سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ سچی نبوت کی عظمت وقوت کیا ہوگی اس کا تو شاید ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جھوٹی نبوت میں اتنی طاقت ہے کہ قادیانی جماعت کا نظم آج تک قائم ہے۔ اس لیے کہ جس نے بھی کسی کو نبی مان لیا اس کو تو اس کی اطاعت کرنی ہی ہے، وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تب مانوں گا جب آپ مجھے اپنا حکم سمجھا دو گے۔ یہ بات کسی ایسے شخص سے تو کہی جا سکتی ہے کہ جس نے نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو۔ اسی طرح اگر آپ کسی کا دعویٰ نبوت قبول نہیں کرتے تو اس سے دلیل کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جس کی نبوت پر آپ ایمان لے آئے اس کا تو فرمادینا دلیل ہے۔ قرآن کہتا ہے ﴿مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ق وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾ (الحشر: ۷) ''رسول تم کو جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے تم کو منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔'' اب تو دجال ہی نبوت کا دعویٰ کریں گے۔ ایک دجال ''مسیلمہ کذاب'' بالکل ابتدائی دور میں ہی پیدا ہو گیا تھا، اس کے بعد کوئی دجال ایران میں پیدا ہو گیا تو کوئی ہندوستان میں، شاید کوئی اور بھی دجال پیدا ہو جائے۔ وہ المسیح الدجال تو خروج کرے گا ہی احادیث میں جس کی خبر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دجال بھی پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن نبی اب بہر حال کوئی نہیں آئے گا۔

۲۶۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آزاد کرنے کے بعد نبی ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ تاہم جاہلی روایات کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کو صلبی بیٹے کا درجہ اور قانونی حقوق دینے کی ممانعت فرمادی تھی۔

۲۷۔ روایات میں ہے کہ بعض حضرات نے اس پر اعتراض بھی کیا مگر نبی ﷺ نے ان کے اعتراض کو سختی کے ساتھ مسترد فرما دیا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد جب اس لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لیے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے لشکر میں عدم شمولیت کی اجازت باقاعدہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے حاصل کی کہ ہم دونوں اب ملکی نظام کے چلانے میں مصروف ہوں گے۔ نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو گھوڑے پر سوار کر کے اور خود پیدل چل کر لشکر کو رخصت کیا۔

۲۸۔ ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' یہی فتنہ آج انکارِ سنت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں، بس اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔

۲۹۔ فلسطین میں اسرائیل نے P.L.O کے ساتھ مصالحت اس لیے کی ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے۔ یہودی یہ کام کیوں کریں، یہودی قتل کریں گے تو ان کے قتل ہونے کا بھی خطرہ رہے گا۔ اسی لیے منصوبہ بنایا گیا کہ ان کی چھوٹی سی حکومت محدود اختیارات کے ساتھ بنادو، تاکہ یاسر عرفات فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ وہی کچھ کریں جو حسنی مبارک مصری مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔

۳۰۔ انہوں نے اس کام کو چھوڑ کر اپنی توانائیاں جہادِ حریت میں کھپانی شروع کر دیں اور کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ بات میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس ابوالکلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام سے ہے۔

۳۱۔ امام فخر الدین رازیؒ (۱۱۴۹۔۱۲۰۹) محدث، فقیہہ اور فلسفی مشہور تفسیر ''التفسیر الکبیر'' کے مصنف ہیں۔

۳۲۔ جاراللہ زمخشری (۱۰۷۵۔۱۱۴۴) لغت، نحو، بلاعت اور تفسیر کے امام معتزلی مسلک رکھتے تھا انکشاف عن حقاق التنزیل ان کی مشہور تفسیر ہے۔

۳۳۔ یہاں ایک بات ان لوگوں سے کہوں گا جنہوں نے دنیوی علوم وفنون تو سیکھ لیے لیکن اتنی عربی زبان نہیں سیکھی کہ قرآن کو براہ راست سمجھ سکیں۔ وہ سوچ لیں کہ اللہ کے حضور کیا جواب دیں گے۔ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ((حاسبوا قبل ان تحاسبوا)) ''محاسبے سے پہلے اپنا احتساب خود کر لو۔'' بقول علامہ اقبال مرحوم

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے

۳۴۔ نص قرآنی میں بھی کام کے ان تین حصوں کا ذکر شجر طیب کے تین حصوں کی صورت میں موجود ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ۔ (آیت ۲۴)

درخت کی ایک جڑ ہوتی ہے، ایک تنا ہوتا ہے اور پھر شاخیں ہوتی ہیں جو پھیل جاتی ہیں۔ درخت کی یہ مثال ایک حدیث مبارکہ میں بھی آئی ہے جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں دین کے عملوں میں سے چوٹی کا عمل اور اس کی جڑ تمہیں بتا دوں۔'' انہوں نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں ضرور ارشاد فرمائیے!'' آپؐ نے فرمایا: ''جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور جس عمل سے دین کی گرفت مضبوط رہتی ہے وہ نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے (یعنی نظم جماعت) اور اس کا چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔''